اوروں کی کہانی
سُن میری زبانی

"ترقی پسند" ادب پر ایک تنقیدی چوٹ

مئی ۱۹۴۴ء

پہلی بار

اپنے دونوں ننھے ننھے بچّوں کے نام !!

جن کی جُدائی نے مجھے پڑھنے کے علاوہ اور کسی کام کا نہ رکھا۔ لہٰذا ہر دو دُنیا میں کچھ نہ کر سکے۔ لیکن اپنے دل شکستہ باپ کو خدمت ادب کی راہ پر ڈالنا انہیں کا تو کام ہے۔

دیش

یہ کتاب دیال پرنٹنگ پریس دہلی میں چھپوا کر دیش نے شائع کی

قیمت [illegible]

گذارش

"ترقی پسند" ادب یا "ادب جدید" کیا شے ہے یہ آج تک ٹھیک طور پر میری سمجھ میں نہیں آیا۔ البتہ ان عنوانوں کے تحت ~~بھی~~ جو مضامین لکھے گئے ہیں انہیں پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ فحش نویسی کا مہذب نام "ادب جدید" ہے۔

قصۂ طوطا مینا۔ الف لیلیٰ اور اسی قسم کی دوسری کتابیں ہمارے نوجوان ادیبوں کو پسند نہیں آئیں۔ انہیں جدت کی تلاش تھی اور ہونی بھی چاہیئے [illegible] افسانے لکھے جانے لگے جن میں روزمرہ کی زندگی کو بغیر کسی بناوٹ کے بیان کیا گیا ہو۔ اور جن میں زندگی کو بہت قریب سے دیکھا گیا ہو ایسے افسانہ نگار اردو ادب سے ذوق رکھنے والے ہر شخص کے شکریے کے مستحق ہیں۔

لیکن۔ بہت سے ترقی پسند نوجوانوں نے اس سے بھی زیادہ جدت دکھانے کے شوق میں بے شمار ایسی چیزیں لکھ ماریں جنہیں ادب سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ جو بالکل تہذیب سے گری ہوئی۔ فحش اور ناقابلِ برداشت ہیں۔ مگر تعجب ہوتا ہے۔ جب ایسی تصانیف کی تعریف کی جاتی ہے۔ اور معترضین کو بتایا جاتا ہے کہ "خود تم گندے خیالات رکھتے ہو۔ اسی لئے یہ چیزیں تمہیں گندی معلوم ہوتی ہیں، ورنہ حقیقت بغیر بناوٹ کے بیان کردی گئی ہے۔"

اِس چھوٹی سی کتاب میں نمونے کے طور پر دو افسانے "دھواں" اور "لحاف" ملاحظہ فرمائیے۔ جن کی تعریف میں کہا گیا ہے کہ "ہمارے ادب کی خوش قسمتی ہے کہ ایسے بیباک مضمون لکھے جانے لگے ہیں"۔ آپ خود ہی سوچئے کہ کیا یہ اس لائق ہیں کہ گھر میں آپ کے بچے بچیاں انہیں پڑھیں۔ ان سے ادب کی کیا خدمت ہوئی۔ اِن سے کیا سبق لیا گیا؟

اور ان افسانوں کا مقابلہ کیجئے اسی کتاب کے دیگر افسانوں سے! ان کے بھی خیالات ترقی پسند ہیں۔ اور پُرانی روِش سے ہٹ کر۔ ان میں بھی جدّت ہے۔ بناوٹ سے پاک اور صاف ہیں۔

یہ کتاب شائع کرنے سے میرا مطلب یہی ہے کہ ادب کے ٹھیکیدار یہ مہذب فحش نویس نہ بننے دیئے جاویں۔ اس قسم کی عریاں نویسی کو روکنا ہمارا قومی فرض ہے۔ ہندوستانی معاشرت کا غیروں کے دماغ پر ان چیزوں سے بالکل اُلٹا نقش ثبت ہوگا۔

"دیش"

حصّہ اوّل

"زندگی بہت قریب سے"

(۱) سعادت حسن منٹو۔ "دھواں" صفحہ (۷)

آپ کا دعویٰ ہے کہ آپ "زندگی کو بہت قریب سے دیکھتے ہیں۔ اور وہی لکھتے ہیں جو دیکھتے ہیں۔"

"دھواں" آپ کا ایک ادبی کرشمہ ہے۔ ذرا ملاحظہ فرمائیے کہ یہ کہانی کس ماحول میں لکھی گئی ہے۔ کس معاشرت کی تصویر ہے اور کون سی تہذیب اسے پسند کرتی ہے نیز اس سے ادب یا سوسائٹی کی کیا خدمت ہوئی۔ کیا یہ ہے "ترقی پسند ادب" ہنا

(۲) منشی پریم چند۔ "آنسوؤں کی ہولی" صفحہ (۲۰)

زندگی کو قریب سے اس افسانہ میں دیکھا اور دکھایا گیا ہے۔ فن کی پختگی۔ بامحاورہ اور سلیس زبان کے ذریعہ ادب کی خدمت اور سوسائٹی کی خامیوں اور اس کے سُدھار پر ایسے افسانوں کی ہمیں ضرورت ہے۔

(۳) عظیم بیگ چغتائی۔ "برتھ کنٹرول" صفحہ (۳۶)

ایک انتہا سے زیادہ "ترقی پسند" مضمون۔ لیکن کس خوبصورتی سے تمام مضمون کو غلاظت سے بچایا گیا ہے۔ انہوں نے بھی "زندگی کو قریب سے دیکھا ہے اور بیان بھی وہی کیا ہے جو دیکھا"۔ لیکن "ترقی پسندانہ" انداز سے نہیں۔

"دھواں"

جب یہ افسانہ "شاقی" میں شائع ہوا تو میرے ایک دوست نے جو انگریزی اور اُردو دونوں زبانوں میں لکھتے ہیں۔ اس پر رائے زنی کرتے ہوئے کہا۔
"تمہارا تازہ افسانہ "دھواں" ۔۔۔۔ صاحبہ نے پڑھا۔ ان کا خیال ہے کہ یہ نہایت غلیظ ہے۔"

یہ صاحبہ ڈاکٹری کا امتحان پاس کر چکی ہیں۔ مگر اب ایک عرصہ سے پریکٹس نہیں کرتیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اسی وجہ سے انہیں وہ عمل جراحی پسند نہیں آیا جو میرے افسانہ میں موجود ہے۔۔۔۔۔۔

۔۔۔۔ یہ واضح رہے کہ یہ دھواں اس چوب خشک کا دھواں نہیں جس کا ایک سرا تو جلتا ہے مگر دوسرا بالکل سرد ہوتا ہے۔

منٹو

وہ جب اسکول کی طرف روانہ ہوا تو اُس نے راستے میں ایک قصائی دیکھا۔ جس کے سر پر ایک بہت بڑا ٹوکرا تھا۔ اس ٹوکرے میں دو تازہ ذبح کئے ہوئے بکرے تھے کھالیں اُتری ہوئی تھیں، اور ان کے ننگے گوشت میں سے دھواں اُٹھ رہا تھا۔ جگہ جگہ پر یہ گوشت جسکو دیکھکر مسعود کے ٹھنڈے گالوں پر گرمی کی لہریں سی دوڑ جاتی تھیں

پھڑک رہا تھا جیسے کبھی کبھی اُس کی آنکھ پھڑکا کرتی تھی۔

اس وقت سوا نو بجے ہونگے۔ مگر جھکے ہوئے خاکستری بادلوں کے باعث ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بہت سویرا ہے۔ سردی میں شدت نہیں تھی۔ لیکن راہ چلتے آدمیوں کے منہ سے گرم گرم سماوار کی ٹونٹیوں کی طرح گاڑھا سفید دھواں نکل رہا تھا۔ ہر شے بوجھل دکھائی دیتی تھی جیسے بادلوں کے وزن کے نیچے دبی ہوئی ہے۔ وہم کچھ ایسی ہی کیفیت کا حامل تھا جو ربڑ کے جوتے پہن کر چلنے سے پیدا ہوتی ہے۔ اس کے باوجود کہ بازار میں لوگوں کی آمدورفت جاری تھی اور دوکانوں میں زندگی کے آثار پیدا ہو چکے تھے۔ آوازیں مدھم تھیں، جیسے سرگوشیاں ہو رہی ہیں۔ چُپکے چُپکے، دھیرے دھیرے باتیں ہو رہی ہیں۔ ہولے ہولے لوگ قدم اُٹھا رہے ہیں کہ زیادہ اونچی آواز پیدا نہ ہو۔

مسعود بغل میں بستہ دبائے اسکول جا رہا تھا۔ آج اُس کی چال بھی سست تھی۔ جب اُس نے بے کھال کے تازہ ذبح کئے ہوئے بکروں کے گوشت سے سفید سفید دھواں اُٹھتا دیکھا تو اسے راحت محسوس ہوئی۔ اس دھوئیں نے اس کے ٹھنڈے ٹھنڈے گالوں پر گرم گرم لکیروں کا ایک جال سا بن دیا۔ اس گرمی نے اُسے راحت پہنچائی۔ اور وہ سوچنے لگا کہ سردیوں میں ٹھنڈے یخ ہاتھوں پہ بید کھانے کے بعد اگر یہ دھواں مل جایا کرے تو کتنا اچھا ہو۔

فضا میں اُجلا پن نہیں تھا۔ روشنی تھی مگر دھندلی، کہر کی ایک پتلی سی تہہ

ہر شے پر چڑھی ہوئی تھی۔ جس سے فضا میں گدلا پن پیدا ہو گیا تھا۔ یہ گدلا پن آنکھوں کو اچھا معلوم ہوتا تھا۔ اِس لئے کہ نظر آنے والی چیزوں کی نوک پلک کچھ مدھم پڑ گئی تھی۔

مسعود جب اسکول پہنچا تو اُسے اپنے ساتھیوں سے یہ معلوم کر کے قطعی طور پر خوشی نہ ہوئی کہ اسکول سکتر صاحب کی موت کے باعث بند کر دیا گیا ہے سب لڑکے خوش تھے جس کا ثبوت یہ تھا کہ وہ اپنے بستے ایک جگہ پر رکھ کر اسکول کے صحن میں اوٹ پٹانگ کھیلوں میں مشغول تھے۔ کچھ چھٹی کا پتہ معلوم کرتے ہی گھر چلے گئے تھے۔ کچھ آ رہے تھے۔ اور کچھ نوٹس بورڈ کے پاس جمع تھے۔ اور بار بار ایک ہی عبارت پڑھ رہے تھے۔

مسعود نے جب سُنا کہ سکتر صاحب مر گئے ہیں تو اُسے بالکل افسوس نہ ہوا۔ اُس کا دل جذبات سے بالکل خالی تھا۔ البتہ اُس نے یہ ضرور سوچا کہ پچھلے برس جب اُس کے دادا جان کا انتقال ان ہی دنوں میں ہوا تھا تو اُن کا جنازہ لیجانے میں بڑی دقت ہوئی تھی اِس لئے کہ بارش شروع ہو گئی تھی۔ وہ بھی جنازے کے ساتھ گیا تھا اور قبرستان میں پکنی کیچڑ کے باعث ایسا پھسلا تھا کہ کھُدی ہوئی قبر میں گرتے گرتے بچا تھا۔ یہ سب باتیں اُس کو اچھی طرح یاد تھیں۔ سردی کی شدت، اُس کے کیچڑ سے لت پت کپڑے، سُرخی مائل نیلے ہاتھ جن کو دبانے سے سفید سفید دھبے پڑ جاتے تھے۔ ناک جو کہ برف کی ڈلی معلوم ہوتی تھی اور

آکر ہاتھ پاؤں دھونے اور کپڑے بدلنے کا مرحلہ ـــــ یہ سب کچھ اُس کو اچھّی طرح یاد تھا، چنانچہ جب اُس نے سکتّر صاحب کی موت کی خبر سُنی تو یہ بیتی ہوئی باتیں یاد آگئیں اور اُس نے سوچا، جب سکتّر صاحب کا جنازہ اُٹھے گا تو بارش شروع ہوجائیگی اور قبرستان میں اتنی کیچڑ ہوجائیگی کہ کئی لوگ پھسلیں گے اور اُن کو ایسی چوٹیں آئیں گی کہ بلبلا اُٹھیں گے۔

مسعود نے یہ خبر سُنکر سیدھا اپنے کمرے کا رُخ کیا۔ کمرے میں پہنچ کر اُس نے اپنے ڈیسک کا تالا کھولا۔ دو تین کتابیں جو کہ اُسے دوسرے روز پھر لانا تھیں، اس میں رکھیں اور باقی بستہ اُٹھا کر گھر کی جانب چل پڑا۔

راستے میں اُس نے پھر وہی دو تازہ ذبح کئے ہوئے بکرے دیکھے۔ اُن میں سے ایک کو اب قصائی نے لٹکا دیا تھا۔ دوسرا تختے پر پڑا تھا۔ جب مسعود دوکان پر سے گزرا تو اس کے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ وہ گوشت کو جس میں سے دھواں اُٹھ رہا تھا چھوکر دیکھے، چنانچہ آگے بڑھکر اُس نے اُنگلی سے بکرے کے اُس حصّے کو چھوکر دیکھا جو ابھی تک پھڑک رہا تھا۔ گوشت گرم تھا۔ مسعود کی ٹھنڈی اُنگلی کو یہ حرارت بہت بھلی معلوم ہوئی۔ قصائی دُکان کے اندر چھریاں تیز کرنے میں مصروف تھا۔ چنانچہ مسعود نے ایک بار پھر گوشت کو چھوکر دیکھا اور وہاں سے چل پڑا۔

گھر پہنچ کر اُس نے جب اپنی ماں کو سکتّر صاحب کی موت کی خبر سُنائی

تو اُسے معلوم ہوا کہ اُس کے اَباجی اُنہی کے جنازے کے ساتھ گئے ہیں۔ اب گھر میں صرف دو آدمی تھے۔ ماں اور بڑی بہن۔ ماں باورچی خانہ میں بیٹھی سالن پکا رہی تھی اور بڑی بہن کلثوم پاس ہی ایک کانگڑی لئے درباری کی سرگم یاد کر رہی تھی۔

چونکہ گلی کے دوسرے لڑکے گورنمنٹ اسکول میں پڑھتے تھے جس پر اسلامیہ اسکول کے سکتّر کی موت کا کچھ اثر نہیں پڑا تھا۔ اس لئے مسعود نے خود کو بالکل بیکار محسوس کیا۔ اسکول کا کوئی کام بھی نہیں تھا چھٹی جماعت میں جو کچھ پڑھایا جاتا ہے وہ گھر میں اپنے اَباجی سے پڑھ چکا تھا۔ کھیلنے کیلئے بھی اس کے پاس کوئی چیز نہ تھی۔ ایک میلا کچیلا تاش طاق میں پڑا تھا۔ مگر اُس سے مسعود کو کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ لوڈو اور اسی قسم کے دوسرے کھیل جو اُس کی بڑی بہن اپنی سہیلیوں کے ساتھ ہر روز کھیلتی تھی اُس کی سمجھ سے بالاتر تھے۔ سمجھ سے بالاتر یوں تھے کہ مسعود نے کبھی اُن کے سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی تھی۔ اس کو فطرتاً ایسے کھیلوں سے کوئی لگاؤ نہیں تھا۔

بستہ اپنی جگہ پر رکھنے اور کوٹ اُتارنے کے بعد وہ باورچی خانہ میں اپنی ماں کے پاس بیٹھ گیا اور درباری کی سرگم سُنتا رہا۔ جس میں کئی دفعہ سارے، گاما آتا تھا۔ اُس کی ماں پالک کاٹ رہی تھی۔ پالک کاٹنے کے بعد اُس نے سر سبز پتّوں کا گیلا گیلا ڈھیر اُٹھا کر ہنڈیا میں ڈال دیا۔ تھوڑی دیر کے بعد جب پالک

کو آنچ لگی تو اُس میں سے سفید سفید دُھواں اُٹھنے لگا۔ اس دھوئیں کو دیکھکر مسعود کو بکرے کا گوشت یاد آ گیا۔ چنانچہ اُس نے اپنی ماں سے کہا۔" امّی جان آج میں نے قصائی کی دُکان پر دو بکرے دیکھے۔ کھال اُتری ہوئی تھی۔ اور اُن میں سے دُھواں نکل رہا تھا بالکل ایسے ہی جیسا کہ صبح سویرے میرے مُنہ سے نکلا کرتا ہے۔

"اچھا ــــ!" یہ کہکر اس کی ماں چولھے میں لکڑیوں کے کوئلے جھاڑنے لگی۔

"ہاں اور میں نے گوشت کو اپنی اُنگلی سے چھُو کر دیکھا تو وہ گرم تھا۔"

"اچھا ــــ!" یہ کہکر اُسکی ماں نے وہ برتن اُٹھایا جس میں اُس نے پالک کا ساگ دھویا تھا اور باورچی خانہ سے باہر چلی گئی۔

"اور یہ گوشت کئی جگہ پہ پھڑکتا بھی تھا۔"

"اچھا ــــ!" مسعود کی بڑی بہن نے درباری سرگم یاد کرنا چھوڑ دی اور اس کی طرف متوجہ ہوئی۔ "کیسے پھڑکتا تھا؟"

"یوں ــــ یوں۔" مسعود نے انگلیوں سے پھڑکن پیدا کر کے اپنی بہن کو دکھائی۔

"تو پھر کیا ہوا؟"

یہ سوال کلثوم نے اپنے سرگم بھرے دماغ سے کچھ اس طور پہ نکالا کہ مسعود ایک لحظے کیلئے بالکل خالی الذہن ہو گیا۔" پھر کیا ہونا تھا۔ میں نے تو ایسے ہی آپ سے بات کی تھی۔ کہ قصائی کی دُکان پر گوشت پھڑک رہا تھا۔ میں نے اُنگلی

سے چھو کر بھی دیکھا تھا۔ گرم تھا!"

"گرم تھا ـــــ اچھا مسعود یہ بتاؤ تم میرا ایک کام کرو گے؟"

"بتائیے۔"

"آؤ میرے ساتھ آؤ۔"

"نہیں آپ پہلے بتائیے۔ کام کیا ہے؟"

"تم آؤ تو سہی میرے ساتھ۔"

"جی نہیں ـــــ آپ پہلے کام بتائیے۔"

"دیکھو میری کمر میں بڑا درد ہو رہا ہے ـــــ میں پلنگ پر لیٹتی ہوں تم ذرا پاؤں سے دبا دینا ـــــ اچھے بھائی جو ہوئے ـــــ اللہ کی قسم بڑا درد ہو رہا ہے۔" یہ کہکر مسعود کی بہن نے اپنی کمر پر مکیاں مارنا شروع کر دیں۔

"یہ آپ کی کمر کو کیا ہو جاتا ہے۔ جب دیکھو درد ہو رہا ہے۔ اور پھر آپ دبواتی بھی مجھی سے ہیں۔ کیوں نہیں اپنی سہیلیوں سے کہتیں" مسعود اٹھ کھڑا ہوا۔

"چلئے، لیکن میں یہ آپ سے کہے دیتا ہوں کہ دس منٹ سے زیادہ میں بالکل نہیں دباؤں گا۔"

"شاباش ـــــ شاباش۔" اس کی بہن اٹھ کھڑی ہوئی اور سر گموں کی

کاپی سامنے طاق میں رکھکر اُس کمرے کی طرف روانہ ہوئی - جہاں وہ اور مسعود دونوں سوتے تھے -

صحن میں پہنچ کر اُس نے اپنی دُکھتی ہوئی کمر سیدھی کی اور اوپر آسمان کی طرف دیکھا - مٹیالے بادل جھکے ہوئے تھے " مسعود آج ضرور بارش ہوگی۔" یہ کہکر اُس نے مسعود کی طرف دیکھا مگر وہ اندر اپنی چارپائی پر لیٹا تھا -

جب کلثوم اپنے پلنگ پر اوندھے منہ لیٹ گئی تو مسعود نے اٹھ کر گھڑی میں دیکھا - " دیکھئے باجی گیارہ بجنے میں دس منٹ باقی ہیں - میں پورے گیارہ بجے آپ کی کمر دابنا چھوڑ دوں گا -"

" بہت اچھا لیکن اب تم خدا کیلئے زیادہ نخرے نہ بگھارو - اِدھر میرے پلنگ پر آکر جلدی کمر دباؤ - ورنہ یاد رکھو بڑے زور سے کان اینٹھوں گی " کلثوم نے مسعود کو ڈانٹ پلائی - مسعود نے اپنی بڑی بہن کے حکم کی تعمیل کی - اور دیوار کا سہارا لیکر پاؤں سے اس کی کمر دبانا شروع کر دی - مسعود کے وزن کے نیچے کلثوم کی چوڑی چکلی کمر میں خفیف سا جھکاؤ پیدا ہو گیا - جب اُس نے پیروں سے دبانا شروع کیا - ٹھیک اسی طرح جس طرح مزدور مٹی گوندھتے ہیں - تو کلثوم نے مزا لینے کی خاطر ہولے ہولے ہائے ہائے کرنا شروع کیا -

کلثوم کے کولہوں پر گوشت زیادہ تھا - جب مسعود کا پاؤں اس حصے پر پڑا تو اُسے ایسا محسوس ہوا کہ وہ اُس بکرے کے گوشت کو دبا رہا ہے جو اُس نے

قصائی کی دُکان پر اپنی اُنگلی سے چھو کر دیکھا تھا۔ اِس احساس نے چند لمحات کے لئے اُس کے دل و دماغ میں ایسے خیالات پیدا کئے جن کا کوئی سر تھا نہ پیر۔ وہ اُن کا مطلب نہ سمجھ سکا۔ اور سمجھتا بھی کیسے جبکہ کوئی خیال مکمل نہیں تھا۔

ایک دو بار مسعود نے یہ بھی محسوس کیا کہ اُس کے پیروں کے نیچے گوشت کے لوتھڑوں میں حرکت پیدا ہوئی ہے، اسی قسم کی حرکت جو اُس نے بکرے کے گرم گرم گوشت میں دیکھی تھی۔ اُس نے بڑی بد دلی سے کمر دبانا شروع کی تھی۔ مگر اب اُسے اس کام میں لذت محسوس ہونے لگی۔ اُس کے وزن کے نیچے کلثوم ہولے ہولے کراہ رہی تھی۔ یہ بھنچی بھنچی آواز جو کہ مسعود کے پیروں کی حرکت کا ساتھ دے رہی تھی اُس گمنام سی لذت میں اضافہ کر رہی تھی۔

ٹائم پیس میں گیارہ بج گئے مگر مسعود اپنی بہن کلثوم کی کمر دباتا رہا۔ جب کمر اچھی طرح دبائی جا چکی تو کلثوم سیدھی لیٹ گئی۔ اور کہنے لگی، "شاباش مسعود! شاباش۔ لو اب لگے ہاتھوں ٹانگیں بھی دبا دو۔ بالکل اسی طرح —— شاباش میرے بھائی۔"

مسعود نے دیوار کا سہارا لیکر کلثوم کی رانوں پر جب اپنا پورا وزن ڈالا تو اُس کے پاؤں کے نیچے مچھلیاں سی تڑپ گئیں۔ بے اختیار وہ ہنس پڑی۔ اور دُہری ہوگئی، مسعود گرتے گرتے بچا۔ لیکن اُس کے تلوؤں میں مچھلیوں کی وہ تڑپ منجمد سی ہوگئی۔ اُس کے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ وہ پھر اسی طرح دیوار کا سہارا

لیکر اپنی بہن کی ٹانگیں دبائے۔ چنانچہ اُس نے کہا۔ "یہ آپ نے ہنسنا کیوں شروع کر دیا۔ سیدھی لیٹ جائیے۔ میں آپ کی ٹانگیں دبا دوں۔"

کلثوم سیدھی لیٹ گئی۔ رانوں کی مچھلیاں اِدھر اُدھر ہونے کے باعث جو گدگدی پیدا ہوئی تھی اُس کا اثر ابھی تک اس کے جسم میں باقی تھا۔ "نا بھائی — میرے گدگدی ہوتی ہے۔ تم اوٹ پٹانگ طریقے سے دباتے ہو۔"

مسعود نے خیال کیا کہ شاید اُس نے غلط طریقہ استعمال کیا ہے۔ "نہیں۔ اِکی دفعہ میں پورا بوجھ آپ پر نہیں ڈالوں گا — آپ اطمینان رکھیے۔ اب ایسی اچھی طرح دباؤں گا کہ آپ کو کوئی تکلیف نہ ہوگی۔"

دیوار کا سہارا لیکر مسعود نے اپنے جسم کو تولا۔ اور اس انداز سے آہستہ آہستہ کلثوم کی رانوں پر اپنے پیر جمائے کہ اس کا آدھا بوجھ کہیں غائب ہو گیا۔ ہولے ہولے بڑی ہوشیاری سے اُس نے اپنے پیر چلانے شروع کئے۔ کلثوم کی رانوں میں اکڑی ہوئی مچھلیاں اُس کے پیروں کے نیچے دب دب کر اِدھر اُدھر پھسلنے لگیں۔ مسعود نے ایک بار اسکول میں تنے ہوئے رسّے پر ایک بازیگر کو چلتے دیکھا تھا۔ اُس نے سوچا کہ بازیگر کے پیروں کے نیچے تنا ہوا رسّا اسی طرح پھسلتا ہوگا۔

اِس سے پہلے کئی بار اُس نے اپنی بہن کلثوم کی ٹانگیں دبائی تھیں مگر وہ لذّت جو کہ اُسے اب محسوس ہو رہی تھی پہلے کبھی محسوس نہیں ہوئی تھی۔ بکرے

کے گرم گرم گوشت کا اُسے بار بار خیال آتا تھا۔ ایک دو مرتبہ اُس نے سوچا "کلثوم کو اگر ذبح کر دیا جائے تو کھال اُتر جانے پر کیا اُس کے گوشت میں سے بھی دُھواں نکلے گا؟" لیکن ایسی بیہودہ باتیں سوچنے پر اُس نے اپنے آپ کو مجرم محسوس کیا اور دماغ کو اس طرح صاف کر دیا جیسے وہ سلیٹ کو اسفنج سے صاف کیا کرتا تھا۔

"بس۔ بس" ۔ کلثوم تھک گئی۔ "بس بس"۔

مسعود کو ایک دم شرارت سوجھی۔ وہ پلنگ پر سے نیچے اُترنے لگا تو اُس نے کلثوم کی دونوں بغلوں میں گدگدی کرنا شروع کر دی۔ ہنسی کے مارے وہ لوٹ پوٹ ہو گئی۔ اُس میں اتنی سکت نہیں تھی کہ وہ مسعود کے ہاتھوں کو پرے جھٹک دے۔ لیکن جب اُس نے ارادہ کر کے اُس کے لات جمانی چاہی تو مسعود اُچھل کر زد سے باہر ہو گیا۔ اور سلیپر پہن کر کمرے سے نکل گیا۔

جب وہ صحن میں داخل ہوا تو اس نے دیکھا کہ ہلکی ہلکی بوندا باندی ہو رہی تھی۔ بادل اور بھی جھک آئے تھے۔ پانی کے ننھے ننھے قطرے آواز پیدا کئے بغیر صحن کی اینٹوں میں آہستہ آہستہ جذب ہو رہے تھے۔ مسعود کا جسم ایک دلنواز حرارت محسوس کر رہا تھا۔ جب ہوا کا ٹھنڈا ٹھنڈا جھونکا اُس کے گالوں کے ساتھ مس ہوا اور دو تین ننھی ننھی بوندیں اس کی ناک پر پڑیں تو ایک جھرجھری سی اُس کے بدن میں لہرا اُٹھی۔ سامنے کوٹھے کی دیوار پر ایک کبوتر اور ایک کبوتری

پاس پاس پر پھیلائے بیٹھے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دونوں دم پخت کی ہوئی ہنڈیا کی طرح گرم ہیں۔ گل داؤدی اور نازبو کے ہرے ہرے پتے اور لال لال گملوں میں نہا رہے تھے۔ فضا میں نیندیں گھلی ہوئی تھیں۔ ایسی نیندیں جن میں بیداری زیادہ ہوتی ہے۔ اور انسان کے ارد گرد نرم نرم خواب یوں لپٹ جاتے ہیں جیسے اونی کپڑے۔

مسعود ایسی باتیں سوچنے لگا جن کا مطلب اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا وہ ان باتوں کو چھو کر دیکھ سکتا تھا مگر ان کا مطلب اس کی گرفت سے باہر تھا۔ پھر بھی ایک گمنام سا مزا اس سوچ بچار میں اسے آ رہا تھا۔

بارش میں کچھ دیر کھڑے رہنے کے باعث جب مسعود کے ہاتھ بالکل یخ ہو گئے اور دبانے سے ان پر سفید دھبے پڑنے لگے تو اس نے مٹھیاں کس لیں اور ان کو منہ کی بھاپ سے گرم کرنا شروع کیا۔ ہاتھوں کو اس عمل سے کچھ گرمی تو پہنچی مگر وہ نم آلود ہو گئے۔ چنانچہ آگ تاپنے کے لئے وہ باورچی خانہ میں چلا گیا۔ کھانا تیار تھا۔ ابھی اس نے پہلا لقمہ ہی اٹھایا تھا کہ اس کا باپ قبرستان سے واپس آ گیا۔ باپ بیٹے میں کوئی بات نہ ہوئی۔ مسعود کی ماں اٹھ کر فوراً دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ اور وہاں دیر تک اپنے خاوند کے ساتھ باتیں کرتی رہی۔

کھانے سے فارغ ہو کر مسعود بیٹھک میں چلا گیا۔ اور کھڑکی کھول کر فرش پر لیٹ گیا۔ بارش کی وجہ سے سردی کی شدت بڑھ گئی تھی۔ کیونکہ اب ہوا بھی

چل رہی تھی۔ مگر یہ سردی ناخوشگوار معلوم نہیں ہوتی تھی۔ تالاب کے پانی کی طرح یہ اُوپر ٹھنڈی اور اندر گرم تھی۔ مسعود جب فرش پر لیٹا تو اس کے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ وہ اس سردی کے اندر دھنس جائے جہاں اُس کے جسم کو راحت انگیز گرمی پہنچے۔ دیر تک وہ ایسی شیر گرم باتوں کے متعلق سوچتا رہا۔ جس کے باعث اُس کے پٹھوں میں ہلکی ہلکی سی دُکھن پیدا ہوگئی۔ ایک دو بار اُس نے انگڑائی لی تو اُسے مزا آیا۔ اُس کے جسم کے کسی حصّے میں، یہ اُس کو معلوم نہیں تھا کہ کہاں۔ کوئی چیز اٹک سی گئی تھی، یہ چیز کیا تھی۔ اس کے متعلق بھی مسعود کو علم نہیں تھا۔ البتہ اس اٹکاؤ نے اس کے سارے جسم میں اضطراب، ایک دبے ہوئے اضطراب کی کیفیت پیدا کر دی تھی۔ اس کا سارا جسم کھنچ کر لمبا ہو جانے کا ارادہ بن گیا تھا۔

دیر تک گدگدے قالین پر کروٹیں بدلنے کے بعد وہ اُٹھا اور باورچی خانہ سے ہوتا ہوا صحن میں آنکلا۔ نہ کوئی باورچی خانہ میں تھا اور نہ صحن میں۔ اِدھر اُدھر جتنے کمرے تھے سب کے سب بند تھے۔ بارش اب رُک گئی تھی۔ مسعود نے ہاکی اور گیند نکالی اور صحن میں کھیلنا شروع کر دیا۔ ایک بار جب اُس نے زور سے ہٹ لگائی تو گیند صحن کے داہنے ہاتھ والے کمرے کے دروازہ پر لگی۔ اندر سے مسعود کے باپ کی آواز آئی۔ ”کون؟“

”جی میں ہوں مسعود!“

اندر سے آواز آئی "کیا کر رہے ہو؟"

"جی کھیل رہا ہوں۔"

"کھیلو ——" پھر تھوڑے سے توقف کے بعد اس کے باپ نے کہا "تمہاری ماں میرا سر دبا رہی ہے —— زیادہ شور نہ مچانا۔

یہ سنکر مسعود نے گیند وہیں پڑی رہنے دی اور ہاکی ہاتھ میں لئے سامنے والے کمرے کا رخ کیا۔ اس کا ایک دروازہ بند تھا۔ اور دوسرا نیم وا۔ —— مسعود کو ایک شرارت سوجھی۔ دبے پاؤں وہ نیم وا دروازے کی طرف بڑھا اور دھماکے کے ساتھ دونوں پٹ کھول دیئے۔ دو چیخیں بلند ہوئیں اور کلثوم اور اس کی سہیلی بملا نے جو کہ پاس پاس لیٹی تھیں، خوفزدہ ہو کر جھٹ سے لحاف اوڑھ لیا۔

بملا کے بلاؤز کے بٹن کھلے ہوئے تھے اور کلثوم اس کے عریاں سینے کو گھور رہی تھی

مسعود کچھ سمجھ نہ سکا، اس کے دماغ میں دھواں سا چھا گیا۔ وہاں سے الٹے قدم لوٹ کر وہ جب بیٹھک کی طرف روانہ ہوا تو اسے معاً اپنے اندر ایک انتہاہ طاقت کا احساس ہوا۔ جس نے کچھ دیر کے لئے اس کی سوچنے سمجھنے کی قوت بالکل کمزور کر دی۔

بٹیھک میں کھڑکی کے پاس بیٹھ کر جب مسعود نے ہاکی دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر گھٹنے پر رکھا تو یہ سوچا کہ ہلکا سا دباؤ ڈالنے پر ہاکی میں خم پیدا ہو جائیگا۔ اور زیادہ زور لگانے پر ہینڈل چٹاخ سے ٹوٹ جائیگا۔ اس نے گھٹنے پر ہاکی کے ہینڈل میں خم تو پیدا کر لیا مگر زیادہ سے زیادہ زور لگانے پر بھی وہ ٹوٹ نہ سکا۔ دیر تک وہ ہاکی کے ساتھ کشتی لڑتا رہا۔ جب وہ تھک کر ہار گیا تو جھنجلا کر اُس نے ہاکی پرے پھینک دی۔

۲۲
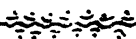
آنسوؤں کی ہولی

(۱)

ناموں کے بگاڑنے کا رواج نہ جانے کب چلا اور کہاں شروع ہوا۔ کوئی اِس عالمگیر مرض کا پتہ لگائے تو تاریخی دُنیا میں ضرور ہی اپنا نام چھوڑ جائے۔ پنڈت کا نام تو شری بلاس تھا مگر احباب اُنہیں سِلبِل کہا کرتے تھے۔ ناموں کا اثر عادات و اطوار پر بھی کچھ نہ کچھ پڑ جاتا ہے۔ بیچارے سِلبِل واقعی سِلبِل تھے۔ دفتر جارہے ہیں مگر پاجامہ کا ازار بند نیچے لٹک رہا ہے۔ سر پر فیلٹ ٹوپی ہے۔ مگر لمبی سی چوٹی پیچھے جھانک رہی ہے۔ اچکن یوں تو بہت عُمدہ ہے اکپڑا فیشن کے مطابق اسلائی بڑھیا، مگر ذرا نیچی ہوگئی ہے۔ نہ جانے انہیں تیوہاروں سے کیا چڑ تھی۔ دیوالی گذر جاتی مگر وہ بھلا مانس کوڑی ہاتھ میں نہ لیتا۔ اور ہولی کا دن تو ان کے سخت امتحان کا دِن تھا۔ تین روز تک وہ گھر سے باہر نہ نکلتے تھے۔ گھر میں بھی سیاہ کپڑے پہنے بیٹھے رہتے تھے۔ یار لوگ ٹوہ میں رہتے تھے کہ بچہ کہیں پھنس جائیں۔ مگر گھر میں گھس کر تو فوجداری نہیں کی جاتی۔ ایک آدھ مرتبہ پھنسے بھی مگر منت سماجت کر کے بے داغ نِکل گئے۔

مگر اب کے مسئلہ مشکل ہو گیا تھا۔ شاستروں کے مطابق پچیس برس تک برہمچاری رہنے کے بعد انہوں نے اپنا بیاہ کیا تھا۔ برہمچریہ کی پختگی میں جو تھوڑی بہت کسر تھی وہ تین برس کے گونہ والی مدت نے پوری کر دی۔ اگرچہ بیوی کی جانب سے انہیں کوئی اندیشہ نہ تھا۔ وہ عورتوں کے سر چڑھانے کے حامی نہ تھے۔ اس معاملہ میں انہیں وہی اپنا پرانا طریقہ پسند تھا۔ بیوی کو جب سختی سے ڈانٹ دیا تو اس کی مجال ہے کہ رنگ کو ہاتھ لگائے؟ مصیبت یہ تھی کہ خسرال کے لوگ بھی ہولی منانے کے لئے آنیوالے تھے۔ پرانی کہاوت ہے۔ کہ "بہن اندر تو بھائی سکندر" ان سکندروں کے حملہ سے بچنے کی انہیں کوئی تدبیر نہ سوجھتی تھی۔ احباب تو مکان میں نہ جا سکتے تھے مگر سکندروں کو کون روک سکتا ہے؟ بیوی نے آنکھ پھاڑ کر کہا۔

"ارے بھیا، کیا سچ مچ گھر میں رنگ نہ لاؤ گے؟"

سنبل نے تیوریاں بدل کر کہا "بس میں نے ایک مرتبہ کہہ دیا اور بات دہرانا مجھے پسند نہیں۔ گھر میں رنگ نہیں آئیگا اور نہ کوئی رنگ چھوئیگا۔ مجھے کپڑوں پر لال چھینٹے دیکھ کر متلی ہونے لگتی ہے۔ ہمارے گھر میں ایسی ہی ہولی ہوتی ہے۔"

بیوی نے سر جھکا کر کہا۔ "تو نہ لاؤ رنگ ونگ، مجھے رنگ لیکر کیا کرنا ہے؟ جب تمہیں رنگ نہ چھوؤ گے تو میں کیسے چھو سکتی ہوں۔"

سبل نے خوش ہو کر کہا۔ "بیشک۔ یہی وفادار بیوی کا دھرم ہے۔"

"لیکن بھیا تو آنے والے ہیں، وہ کیوں مانیں گے؟"

"اُن کے لئے بھی میں نے ایک تدبیر سوچ لی ہے۔ اُسے کامیاب بنانا تمہارا کام ہے۔ میں بیمار بن جاؤنگا۔ ایک چادر اوڑھ کر لیٹ رہونگا۔ تم کہنا کہ انہیں بخار آ گیا۔ بس چلو چھٹی ہوئی۔"

بیوی نے آنکھیں نچا کر کہا۔ "اے نوج، کیسی باتیں مُنہ سے نکالتے ہو۔ بخار جائے مدعی کے گھر، یہاں آئے تو مُنہ جُھلس دوں نگوڑے کا۔"

"تو پھر دوسری تدبیر ہی کیا ہے؟"

"تم اُوپر والی چھوٹی کوٹھری میں چھپ رہنا۔ میں کہدونگی کہ انہوں نے جلاب لیا ہے، باہر نکلیں گے تو ہوا لگ جائیگی۔"

پنڈت جی کھِل اُٹھے "بس بس۔ یہ سب سے اچھا ہے۔"

(۴)

ہولی کا دن ہے۔ باہر واویلا مچا ہوا ہے۔ زمانہ قدیم میں عبیر اور گلابی کے سوا اور کوئی رنگ نہ چلتا تھا۔ اب نیلا، ہرا، سیاہ سبھی رنگوں کا میل ہو گیا ہے۔ اور اس اتحاد سے بچنا آدمیوں کے لئے تو ممکن نہیں۔ ہاں دیوتا بچیں تو بچیں۔ سبل کے دونوں سالے محلہ بھر کی عورتوں، مردوں بوڑھوں بچّوں کا نشانہ بنے ہوئے تھے۔ اُنہوں نے بھی مٹھنڈا رنگ گھول

رکھا تھا۔ سکندری حملے کر رہے تھے۔ باہر کے دیوان خانے کے فرش، دیواریں حتّٰی کہ تصویریں بھی رنگ گئی تھیں۔ گھر میں بھی یہی حال تھا۔ محلّہ کی نندیں بھلا کب ماننے والی تھیں؟ پرنالہ تک رنگین ہو گیا تھا۔

بڑے سالے نے پوچھا ——— "کیوں ری چمپا، کیا واقعی ان کی طبیعت درست نہیں؟ کھانا کھانے بھی نہ آئے۔"

چمپا نے سر جھکا کر۔ "ہاں بھیا رات ہی سے کچھ پیٹ میں درد ہونے لگا۔ ڈاکٹر نے ہوا میں نکلنے کو منع کر دیا ہے۔"

ذرا دیر بعد چھوٹے سالے نے کہا۔ "کیوں جی جی! کیا بھائی صاحب نیچے نہ آویں گے؟ ایسی بھی کیا بیماری ہے۔ کہو تو اوپر جا کر دیکھ آؤں۔"

چمپا نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔ "نہیں، نہیں۔ اوپر مت جائیو۔ وہ رنگ ونگ نہ کھیلیں گے۔ ڈاکٹر نے ہوا میں نکلنے کو منع کر دیا ہے۔"

دونوں بھائی [illegible] کر رہ گئے۔

دفعتاً چھوٹے بھائی کو ایک بات سوجھی۔ بہن کے کپڑوں کے ساتھ کیوں نہ ہولی کھیلیں؟ وہ تو بیمار نہیں ہیں! بڑے بھائی کے دل میں بھی یہ بات سما گئی۔ بہن بیچاری اب کیا کرتی۔ سکندروں نے کنجیاں اس کے ہاتھ سے لے لیں۔ اور سلیبل کے سارے کپڑے نکال نکال کر رنگ ڈالے رومال تک کورا نہ چھوڑا۔ جب چمپا نے ان کپڑوں کو صحن میں الگنی پر خشک

ہونے کے لئے ڈال دیا۔ تو ایسا معلوم ہوا گویا کسی رنگریز نے شادی کے جوڑے رنگے ہوں۔ سیتل اوپر بیٹھے بیٹھے یہ تماشے دیکھ رہے تھے۔ مگر زبان نہ کھولتے تھے۔ سینہ پر سانپ سا لوٹ رہا تھا۔ سارے کپڑے خراب ہوگئے۔ دفتر جانے کو بھی کچھ نہ بچا۔ ان پاجیوں کو میرے کپڑوں سے نہ جانے کیا عداوت تھی۔

گھر میں انواع و اقسام کے لذیذ کھانے بنا رہے تھے۔ محلہ کی ایک برہمنی کے ساتھ چمپا بھی لگی ہوئی تھی۔ دونوں بھائی اور کئی دیگر اصحاب صحن میں کھانا کھانے بیٹھے تو بڑے سالے نے چمپا سے پوچھا کچھ ان کے لئے بھی کھچڑی وچڑی بنائی ہے۔ پوریاں تو بیچارے آج کھا نہ سکیں گے۔

چمپا نے کہا۔ "ابھی تو نہیں بنائی، اب بنا لونگی"۔

"واہ۔ری تیری عقل! ابھی تک تجھے یہ فکر نہیں کہ وہ بیچارے کھائینگے کیا۔ تو تو اتنی لاپرواہ کبھی نہ تھی۔ جا۔ نکال لا جلدی سے چاول اور دال"۔

لیجئے کھچڑی پکنے لگی۔ ادھر دوستوں نے کھانا کھانا شروع کیا۔ سیتل اوپر بیٹھے اپنے نصیبوں کو رو رہے تھے۔ انہیں اس ساری مصیبت کا ایک ہی سبب معلوم ہوتا تھا، شادی! چمپا نہ آتی تو یہ سالے کیوں آتے۔ کپڑے کیوں خراب ہوتے۔ ہولی کے دن مونگ کی کھچڑی کیوں کھانے کو ملتی۔

مگر اب پچھتانے سے کیا ہوتا ہے۔ جتنی دیر میں لوگوں نے کھانا کھایا اتنی دیر میں کھچڑی تیار ہوگئی۔ بڑے سالے نے خود چمپا کو اُوپر بھیجا کہ کھچڑی کی تھالی اُوپر دے آوے۔

سلبل نے تھالی کی طرف غصہ بھری نگاہوں سے دیکھکر کہا ـــــــ

"اِسے میرے سامنے سے ہٹا لے جا۔"

"کیا آج فاقہ ہی کرو گے؟"

"تمہاری یہی مرضی ہے تو یہی سہی۔"

"میں نے کیا کیا؟ سویرے سے کام میں لگی ہوئی ہوں۔ بھیا نے خود کھچڑی پکوائی اور مجھے یہاں بھیجا۔"

"ہاں وہ تو میں دیکھ رہا ہوں کہ میں گھر کا مالک نہیں۔ سکندروں نے اُس پر قبضہ جما لیا۔ مگر میں یہ نہیں مان سکتا کہ تم چاہتیں تو اور لوگوں سے پہلے ہی میرے پاس تھالی نہ پہنچ جاتی۔ میں اِسے پتی برت دھرم کے خلاف سمجھتا ہوں۔ اور کیا کہوں۔"

"تم تو دیکھ رہے تھے کہ دونوں میرے سر پر سوار تھے۔"

"اچھا مذاق ہے کہ اور لوگ سموسے اور خستہ اُڑاویں اور مجھے مونگ کی کھچڑی دی جاوے۔ واہ ری تقدیر۔"

"تم اِسے دو چار لقمے کھا لو۔ مجھے جیونہی موقع ملیگا، دوسری تھالی لاؤنگی۔"

"سارے کپڑے رنگوا ڈالے۔ اب دفتر کیسے جاؤنگا؟ یہ دل لگی مجھے ذرا بھی نہیں بھاتی۔ میں اسے بدمعاشی کہتا ہوں۔ تم نے صندوق کی کنجی کیوں دیدی، کیا میں اتنا پوچھ سکتا ہوں؟"

"زبردستی چھین لی۔ تم نے سنا نہیں؟ کرتی کیا؟"

"اچھا جو ہوا سو ہوا، یہ تھالی لے جاؤ۔ دھرم سمجھنا تو دوسری تھالی لانا۔ نہیں آج فاقہ ہی سہی۔"

یکایک پیروں کی آہٹ پاکر سبل نے سامنے دیکھا تو دونوں سالے چلے آرہے تھے۔ انہیں دیکھتے ہی بیچارے نے منہ بنا لیا۔ چادر سے بدن ڈھک لیا اور کراہنے لگے۔

بڑے سالے نے کہا۔ "کہئے، کیسی طبیعت ہے؟ تھوڑی سی کھچڑی کھا لیجئے۔"

سبل نے منہ بنا کر کہا۔ "ابھی تو کچھ کھانے کو جی نہیں چاہتا۔"

"نہیں۔ فاقہ تو مضر ہوگا۔ کھچڑی کھا لیجئے۔"

بیچارے سبل نے دل میں ان دونوں شیطانوں کو خوب کوسا اور زہر کی طرح کھچڑی حلق سے نیچے اتاری۔ آج ہولی کے دن کھچڑی ہی قسمت میں لکھی تھی۔ جب تک ساری کھچڑی ختم نہ ہوگئی، دونوں وہاں اڑے رہے۔ گویا جیل کے حکام کسی فاقہ کرنے والے قیدی کو جبراً کھانا کھلا رہے ہوں۔

بیچارے کو ٹھونس ٹھونس کر کھچڑی کو زہر مار کرنا پڑا ۔ پکوانوں کیلئے گنجائش ہی نہ رہی ۔

(۳)

دس بجے رات کو چمپا بڑھیا کھانوں کا تھال لئے شوہر کے پاس پہنچی ۔ حضرت دل ہی دل میں جھنجھلا رہے تھے ۔ بھائیوں کے سامنے میری پرواہ کون کرتا ہے ؟ نہ جانے کہاں سے یہ شیطان پھٹ پڑے ۔ تمام دن فاقہ کرایا اور ابھی تک کھانے کا کہیں پتہ نہیں ۔ آخر چمپا کو تھال لاتے دیکھکر کچھ غصہ ٹھنڈا ہوا ۔ بولے ــــ "ابھی تو بہت سویرا ہے ۔ دو ایک گھنٹے بعد کیوں نہ آئیں ۔"

چمپا نے سامنے تھال رکھکر کہا "تم تو نہ ہاری مانتے ہو نہ جیتی ۔ اب آخر یہ دو مہمان آئے ہوئے ہیں ۔ ان کی آؤ بھگت نہ کروں تو بھی کام نہیں چلتا ۔ تمہیں کو برا معلوم ہوگا ۔ کون روز آویں گے ۔"

"ایشور نہ کرے کہ روز آویں ۔ یہاں تو ایک ہی دن میں کام تمام ہوگیا ۔"

تھال کے خوشبو دار اور لذیذ کھانوں کو دیکھکر دفعتاً پنڈت جی کے چہرہ پر دلاویز تبسم کی لہر دوڑ گئی ۔ ایک ایک چیز کھاتے تھے اور چمپا کو سراہتے تھے ــــ "سچ کہتا ہوں چمپا ! میں نے ایسی چیزیں کبھی نہیں کھائی تھیں ۔ حلوائی کم بخت کیا بنائیگا ۔ جی چاہتا ہے کہ کچھ انعام دوں ۔"

"تم مجھے بنا رہے ہو۔ کیا کروں۔ جیسا بنانا آتا ہے۔ بنا لائی ہوں۔"

"نہیں جی سچ کہہ رہا ہوں۔ میری تو رُوح تک آسودہ ہو گئی۔ آج مجھے معلوم ہوا کہ غذا کا تعلق پیٹ سے اس قدر نہیں جتنا رُوح سے ہے۔ بتلاؤ کیا انعام دوں؟"

"جو مانگوں وہ دو گے؟"

"دونگا۔ جنیؤ کی قسم کھا کر کہتا ہوں۔"

"نہ دو تو میری بات جائے۔"

"کہتا تو ہوں بھئی، اب کیسے کہوں۔ کیا لکھا پڑھی کر دوں؟"

"اچھا تو مانگتی ہوں۔ مجھے اپنے ساتھ ہولی کھیلنے دو۔"

پنڈت جی کا رنگ فق ہو گیا۔ آنکھیں پھاڑ کر بولے۔ "ہولی کھیلنے دوں۔ میں تو ہولی کھیلتا ہی نہیں۔ کبھی نہیں کھیلا۔ ہولی کھیلنا ہوتا تو گھر میں چھپ کر کیوں بیٹھتا۔"

"اوروں کے ساتھ نہ کھیلو، مگر میرے ساتھ تو کھیلنا ہی پڑیگا۔"

"یہ میرے اُصول کے خلاف ہے۔ جس چیز کو اپنے گھر میں جائز سمجھوں اُسے کس الفاظ کے رُو سے باہر ناجائز سمجھوں؟ سوچو!"

چمپا نے سر نیچا کر کے کہا۔ "گھر میں ایسی کتنی باتیں جائز سمجھتے ہو۔ جنھیں گھر کے باہر کرنا ناجائز ہی نہیں بلکہ گناہ ہے۔"

پنڈت جی جھینپ کر بولے "اچھا بھئی تم جیتیں، میں ہارا۔ اب میں تم سے یہی دان مانگتا ہوں ...."

"پہلے میرا انعام دیدو۔ پھر مجھ سے دان مانگنا" یہ کہتے ہوئے چمپا نے رنگ کا لوٹا اٹھا لیا۔ اور پنڈت جی کو سر تا پا تر کر دیا۔ جب تک وہ اٹھ کر بھاگیں۔ اس نے مٹھی بھر گلال لیکر ان کے سارے منہ میں لپیٹ دیا۔

پنڈت جی روتی صورت بنا کر بولے "ابھی اور کچھ کسر باقی ہو تو وہ بھی پوری کر لو۔ میں نہ جانتا تھا کہ تم میری آستین کا سانپ ہوگی۔ اب اور کچھ رنگ باقی نہیں رہا۔"

چمپا نے شوہر کے چہرہ پر نظر ڈالی تو اس پر دلی رنج کا گہرا اثر نمایاں تھا۔ پچھتا کر بولی "کیا تم سچ مچ برا مان گئے؟ میں تو سمجھتی تھی کہ تم صرف مجھے چڑھا رہے ہو۔"

سری بلاس نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا "نہیں چمپا! مجھے برا نہیں لگا۔ ہاں، تم نے مجھے اس فرض کی یاد دلا دی جسے میں اپنی بزدلی کے سبب بھولا بیٹھا ہوا تھا۔ وہ سامنے جو تصویر دیکھتی ہو، میرے دلی دوست منوہر ناتھ کی ہے۔ جو اب اس دنیا میں نہیں ہیں۔ تم سے کیا کہوں کہ کتنا با مذاق، کتنا طبیعت دار اور کتنا جری شخص تھا۔ ملک کی حالت دیکھ دیکھ کر اس کا خون خشک ہوتا رہتا تھا۔ ۱۹، ۲۰ برس کی بھی کوئی عمر ہوتی ہے

مگر وہ اُسی عمر میں اپنی زندگی کا مقصد تجویز کر چکا تھا۔ خدمت کرنے کا موقع پاکر وہ اُس کو اِس طرح پکڑتا تھا گویا دولت ہو۔ استغناء پیدائشی تھا۔ ہوس تو اُسے چھو تک نہ گئی تھی۔ ہمارے اور دوست سیر و تفریح کرتے تھے مگر اس کا راستہ سب سے جُدا تھا۔ راستی پر جان دینے کو تیار۔ کہیں بے انصافی دیکھی اور تیور بدل گئے۔ کہیں اخباروں میں ظلم و تشدد کی خبریں پڑھیں اور چہرہ تمتما اُٹھا۔ ایسا تو میں نے آدمی ہی نہیں دیکھا۔ ایشور نے بے وقت ہی بُلا لیا ورنہ وہ انسانوں میں ایک برگزیدہ شخص ہوتا۔ کسی مصیبت زدہ کی مدد کرنے کو اپنی جان ہتھیلی پر لئے پھرتا تھا۔ عورتوں کی اتنی عزت دتو تیر کوئی کیا کریگا۔ عورت اُس کے لئے پرستش و عقیدت کی چیز تھی۔ پانچ سال ہوئے۔ یہی ہولی کا دن تھا۔ میں بھنگ کے نشہ میں چُور، سر سے پیر تک رنگ میں نہایا ہوا۔ اُس کو گانا سُننے کیلئے بُلانے گیا۔ دیکھا وہ کپڑے پہنے ہوئے کہیں جانے کو تیار تھے۔ پوچھا "کہاں جا رہے ہو؟"

اُس نے میرا ہاتھ پکڑ کر کہا ــــــ "تم اچھے وقت پر آگئے ورنہ مجھے جانا پڑتا۔ ایک اناتھ بڑھیا مر گئی ہے۔ کوئی اُسے کندھا دینے والا نہیں ملتا۔ کوئی کسی دوست سے ملنے گیا ہوا ہے۔ کوئی نشہ میں چُور پڑا ہوا ہے کوئی احباب کی دعوت کر رہا ہے۔ اور کوئی رقص و سرود کی محفل سجائے بیٹھا ہے۔ کوئی لاش اُٹھانے والا نہیں! برہمن، چھتری اُس چمارن کی لاش کو

کیسے چھو ونیگے۔ اُن کا تو دھرم بھرشٹ ہوتا ہے۔ کوئی تیار نہیں ہوتا۔ بڑی مشکل سے دو کہار ملے ہیں۔ ایک میں ہوں۔ اب چوتھے آدمی کی کمی تھی۔ سو ایشور نے تمہیں بھیج دیا۔ چلو چلیں۔

ہائے! اگر میں جانتا کہ یہ پیارے منہر کا آخری حکم ہے تو آج میرے دل کو اتنا رنج نہ ہوتا۔ میرے گھر پر کئی دوست آئے ہوئے تھے گانا ہو رہا تھا۔ اُس وقت لاش اُٹھا کر دریا تک لیجانا مجھے ناگوار تھا۔ بولا۔ "اِس وقت بھئی میں نہ جا سکونگا۔ گھر پہ مہمان جمع ہیں۔ میں تو تمہیں بلانے آیا تھا۔"

منہر نے میری طرف حقارت سے دیکھکر کہا۔ "اچھی بات ہے تم جاؤ ہیں کسی اور کو ڈھونڈھ لونگا۔ مگر مجھے تم سے ایسی اُمید نہ تھی۔ تم نے بھی وہی کہا جو تم سے پیشتر اور لوگوں نے کہا تھا۔ کوئی نئی بات نہیں۔ اگر ہم لوگ اپنے فرض کو بھول نہ گئے ہوتے تو آج یہ حالت ہی کیوں ہوتی؟ ایسی ہولی پر لعنت ہے! تیوہار، تماشہ دیکھنے، عمدہ عمدہ چیزیں کھانے اور بڑھیا بڑھیا پوشاکیں پہننے کا نام نہیں ہے۔ یہ برکت ہے، تپسیا ہے! اپنے بھائیوں سے محبت و ہمدردی جتانا ہی تیوہاروں کا خاص مقصد ہے۔ کپڑے سُرخ کرنے سے پہلے خون کو سُرخ بنا لو۔ سفید خون پر یہ سُرخی زیب نہیں دیتی۔"

یہ کہکر وہ چلا گیا۔ مجھے اُس وقت یہ نصیحت بہت بُری معلوم ہوئی۔ اگر میرے دل میں وہ خدمتی جذبہ نہ تھا تو اُس کو مجھے اِس طرح لعنت ملامت کرنے کا کوئی حق نہ تھا۔ خیر۔ گھر چلا آیا۔ مگر وہ باتیں میرے کانوں میں برابر گونجتی رہیں۔ ہولی کا سارا مزا کِرکِرا ہو گیا!

ایک مہینہ تک ہم دونوں میں ملاقات نہ ہوئی۔ کالج امتحان کی تیاری کے لئے بند ہو گیا تھا۔ اِس لئے کالج میں بھی ملاقات نہ ہوتی تھی۔ مجھے کچھ خبر نہیں کہ وہ کب اور کیسے بیمار پڑا اور کب اپنے گھر گیا۔ دفعتاً ایک روز مجھے اس کا ایک خط ملا۔ ہائے! اُس خط کو پڑھکر آج بھی چھاتی پھٹنے لگتی ہے۔

سری بلاس ایک لمحہ تک گلا بھر آنے کے سبب نہ بول سکے۔ پھر بولے کسی روز تمہیں دکھاؤنگا۔ لکھا تھا کہ مجھ سے آخری مرتبہ مل جاؤ۔ اب شاید اس زندگی میں ملاقات نہ ہو۔ خط میرے ہاتھ سے گر پڑا۔ اُس کا مکان میرٹھ کے ضلع میں تھا۔ دوسری گاڑی جانے میں نصف گھنٹہ باقی تھا۔ میں فوراً روانہ ہو گیا۔ مگر اُسے دیکھنا نہ ہوا تھا۔ میرے پہنچنے سے قبل ہی وہ وفات پا چکا تھا۔ چمپا! اِس کے بعد میں نے ہولی نہیں کھیلی۔ ہولی ہی نہیں، اور سبھی تیوہار چھوڑ دیئے۔ ایشور نے شاید مجھے کام کی طاقت نہیں دی۔ اب بہت چاہتا ہوں کہ کوئی مجھ سے کسی طرح کا خدمتی کام لے۔ خود آگے نہیں بڑھ سکتا لیکن پیچھے چلنے

کے لئے تیار ہوں۔ مگر کوئی مجھ سے کام لینے والا بھی نہیں ہے لیکن آج یہ رنگ ڈال کر تم نے مجھے اُس لعنت کی یاد دلا دی۔ ایشور مجھے ایسی توفیق دے کہ میں دل ہی میں نہیں بلکہ عمل میں بھی مَن ہَرن بنوں!"

یہ کہتے ہوئے سری بلاس نے طشتری سے گلال اُٹھایا اور اُس تصویر پر چھڑک کر اُسے پرنام کیا۔

برتھ کنٹرول

آٹھویں سے نویں جماعت میں آئی۔ خوش خوش بڑی چھٹیوں میں گھر پہنچی۔ تیسرا ہی دن تھا کہ والد صاحب بیمار پڑ گئے۔ اور ہفتہ بھر میں چٹ پٹ ہو گئے۔ ہم دونوں ماں بیٹیوں کیلئے دُنیا اندھیر ہو گئی۔ مرتے مرتے تاکید کر گئے کہ پڑھائی جاری رکھنا۔ انٹرنس پاس کرانا اور اس سے پہلے ہرگز شادی نہ کرنا۔

خدا کی پناہ! دُنیا اندھیر ہو گئی۔ ہم دونوں ماں بیٹیاں، گھر پر دو ڈھائی ہزار کا قرضہ اور آمدنی کا کوئی ذریعہ نہیں۔ ہزار پانسو کا زیور۔ تعلیم کیسی روٹیوں کے لالے پڑ گئے۔ نہ کوئی ہمدرد و غمخوار، نہ عزیز و اقارب رشتے دار۔ الٰہی اب کیا ہوگا؟

اسی فکر میں تھے۔ ابھی چالیسواں بھی نہ ہوا تھا کہ والد مرحوم کے ایک ملنے والے مرزاجی ہمدردی کرنے آئے۔ کیا باتیں ہوئیں، معلوم نہیں۔ مگر والدہ صاحبہ کو میں نے آنسو پونچھکر پڑوسن سے البتہ کہتے سُنا کہ" انہوں نے یہ نہ سوچا کہ مرنے والے کا کفن بھی میلا نہیں ہوا ہے اور میں لڑکی کی شادی رچانے بیٹھونگی۔"

"نگوڑا دیوانہ ہوا ہے۔"

اور ان مرزاجی کی دیوانگی زیر بحث تھی کہ دوسرے روز ایک اور دیوانے کا

اضافہ ہوا۔ ایک اور والد صاحب کے ملنے والے تھے، ان کی بیوی آئیں اور وہ بھی دیوانی نکلیں۔

ان کے علاوہ تین اچھے خاصے اور آدمیوں میں دیوانگی کے اثرات پائے گئے۔ اور مرزا جی پھر گھبرائے حواس باختہ آئے۔ کہنے لگے "میں نے سنا ہے تم نے لڑکی کی شادی طے کرلی۔"

والدہ صاحبہ نے سر پیٹ لیا۔ اور ایک ایک کو کھری کھری سنائی۔ اور پڑوسن بھی سر ہلا کر بولیں "بہن سچی بات تو یہ ہے کہ لڑکی صورت شکل ..... ہماری لڑکی کو نظر بد سے بچائے۔"

"بھاڑ میں گئی صورت اور چولہے میں گئی شکل۔"

"تو سب یہی چاہتے ہیں کہ خوبصورت لڑکی ......"

جل کے اماں جان نے کہا "خوبصورت لڑکی دیکھ پاؤ تو میت کے دن بنا دیدہ!"

مرزا جی کی دیوانگی ذرا پیچیدہ ہوگئی۔ انہوں نے والدہ صاحبہ کے رونے پیٹنے کا بھی نوٹس نہیں لیا۔ ان کی تجویز تھی کہ ان کے لڑکے سے میری شادی ہو جائے۔ پھر تعلیم بھی جاری رہے گی۔ مکان کا قرضہ بھی چکا جائیگا۔ فکر معاش بھی جاتی رہے گی۔

اور اس غم و غصہ کی حالت میں والدہ صاحبہ کو غور کرنا پڑا۔ مکان والدہ صاحبہ کے نام تھا۔ ہزار روپیہ قرض اور لیلیں اور مکان میرے نام کردیں۔ تو مکان میرا ہوگیا۔

اور میرا نکاح اُن کے لڑکے سے کر دیا جائے ۔ پھر میں اُنکی ہوگئی تو میرا مکان قرضہ ادا کر کے وہ چھڑا لیں گے ۔ جس نے سُنا مرزا جی کی تعریف کی ۔ مدد یوں کرتے ہیں کہ مدد لینے والے کو شرم نہ آئے ۔ شادی نہ سہی نکاح تو لازمی ٹھہرا ۔

تجویز قابل عمل تھی ۔ اور اُس پر عمل کر ڈالا گیا ۔ والدہ صاحبہ نے جھٹ سے مکان پر ہزار روپیہ قرضہ اور لے لیا ۔ پھر مکان مجھے بخش کے میرے نام کر دیا مرزا جی نے اپنے صاحبزادے سے میرا نکاح کر دیا ۔ اور قرضہ ادا کر کے مکان چھڑا لیا ۔ موت کا گھر تھا چُپ چپاتے ایک چار آدمی رات کو آئے ۔ قاضی آیا اور نکاح ہوگیا ۔ میرے میاں ریلوے میں ٹکٹ چیکر تھے ۔

اسکول جانے کو ہوئی تو معلوم ہوا کہ ریلوے ملازموں کی بیوی کے سفر کیلئے مُفت کے پاس ملتے ہیں ۔ وہ پاس آ گئے ۔

میرے خُسر صاحب خود اسٹیشن پر آئے اور مجھے آرام سے سوار کرا دیا ۔ اور ریلوے گارڈ سے بھی کہہ دیا کہ میرا خیال رکھے ۔ اسکول والوں کو تار دیدیا تھا ۔ اسٹیشن پر اسکول کی نوکرنی آ کر مجھے لے گئی ۔

اسکول پہنچے دوسرا مہینہ تھا کہ ایک دس روپے کا منی آرڈر آیا ۔ بھیجنے والا کون ؟ میرے میاں ۔ کوپن میں صرف اتنا لکھا تھا کہ "یہ جیب خرچ کو بھیجتا ہوں ضرورت ہو تو اور منگا لینا" ۔ اسکے تذکرے کی ضرورت نہیں ۔ میں تو بڑی پریشان سی ہوگئی مگر ساتھ والیوں نے کہا "کمبخت اس میں کیا حرج ہے ۔ لیلو نا" ۔ میں نے منی آرڈر لے لیا ۔ اور

پھر ہر مہینے دس روپیہ آنے لگے۔

تیسرے مہینے ایک خط آیا۔ ایک لڑکی کے ذریعہ ملا۔ وہ گھر سے آئی تھی۔ اُس کے بھائی نے یہ خط دیا تھا۔ کیسا خط!

"پڑھ لو نا" اُس نے مُسکرا کر کہا۔ اُس کے چہرے پر مُسکراہٹ تھی اور آنکھوں میں شرارت۔

یہ خط میرے میاں کا تھا۔ ٹھیک ہی تھا۔ مگر ایک بات قابلِ غور، وہ مجھ سے ملنا چاہتے تھے۔ بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ میں کیا جواب دیتی۔ اور میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔

ریلوے کے پاس مُفت کے ملتے تھے۔ ریل گھر کی سمجھو۔ عید پر آئی اور گئی بقرعید پر آئی۔ واپس جاتی تھی، عجیب معاملہ پیش آیا۔

(۲)

شام کا جھٹپٹا تھا۔ ریل کسی چھوٹے سے ویران اسٹیشن پر کھڑی ڈاک گاڑی کا انتظار کر رہی تھی۔ میدانوں میں تیزی سے دھندلکا پھیل رہا تھا۔ زنانہ انٹر کلاس میں اکیلی تھک کر چور ہو رہی تھی۔ گاڑی کے تکلیف دہ قیام نے اور بھی حیران کر دیا۔ تھک کر آنکھیں میچ کر لیٹ رہی ——!

انجن کی سنسناہٹ کانوں میں گونج رہی تھی۔ پاس کے ڈبہ میں کوئی بچہ رو رہا تھا۔ میں خاموش آنکھیں بند کئے لیٹی تھی کہ ایکدم سے کسی نے میرا مُنہ چوم لیا۔ میں ہڑبڑا کر

اُچھل پڑی۔ کوئی شخص جھٹ سے کُود کر بھاگا۔ میں نے باہر جھانک کر دیکھا۔ کوئی ریلوے بابو تھا۔ وردی پہنے۔ دراز قد۔ جھٹ سے ایک ڈبہ میں چڑھ گیا۔ اتنے میں ڈاک گاڑی کی چنگھاڑ سُنائی دی۔ دندناتی آئی۔ سارا میدان ہل گیا اور چشم زدن میں بجلی کی طرح کوند گئی۔ ہماری گاڑی بھی چلدی۔ میں بڑی حیران اور پریشان تھی۔ ریلوے کے قصے سُن چکی تھی۔ جان پہچان گارڈ کا حلقہ ختم ہوچکا تھا۔ رات آرہی تھی۔ سوچی کہ آگے چل کر تیسرے درجے میں جا بیٹھوں گی۔

اگلا اسٹیشن آیا اور جیسے ہی گاڑی چلی ہے کوئی شخص کھڑکی پکڑ کر پائیدان پر کھڑا ہوگیا۔ میں ایک دم سے چونک پڑی اور قبل اسکے کہ کچھ کہوں۔ اُس نے کہا "ٹکٹ"

میں نے غور سے دیکھا تو یہ وہی شخص تھا۔ نوجوان شخص۔ نیلی وردی پہنے۔ گورا رنگ کھلتا ہوا۔ چھوٹی چھوٹی مونچھیں۔

میں نے کہا "میں ٹکٹ نہیں دکھاتی۔ تم کون ہو" اور جب دیکھا کہ اندر گھسا آتا ہے اور گاڑی تیز ہوتی جاتی ہے تو میں نے ہمت کر کے اُسکو دھکیلا۔ "ارے۔ ارے میں......" ایک کشمکش ہوئی اور میں نے اُس کے ہاتھ چھڑا دیئے۔ وہ کود گیا۔ اور جھٹ سے ایک ڈبے میں بیٹھ گیا۔ میرا بدن مارے خوف کے کانپ رہا تھا۔ سارے بدن میں تھرتھری تھی۔ سانس تیزی سے چل رہا تھا۔ اور بڑی دیر میں جا کر ہوش ٹھکانے ہوئے۔

دوسرا اسٹیشن آیا۔ یہاں گاڑی کافی دیر ٹھیرتی تھی۔ میں نے اُسے دیکھا کہ فاصلہ پر پلیٹ فارم پر کھڑا وہ میری طرف دیکھ رہا ہے۔ مجھے کیا کرنا چاہیئے؟ یہ میں سوچ رہی

تھی کہ ایک ریلوے قلی پاس سے گذرا۔ میں نے اُسے اِشارہ کیا اور کہا کہ اسٹیشن ماسٹر صاحب کو بُلا لائے۔

وہ سامنے ہی کچھ دور کھڑے تھے۔ قلی نے جا کر کہہ دیا اور اُنگلی سے میری طرف اِشارہ کیا۔ وہ آ گئے۔ میں نے برقعہ سے اپنا مُنہ چھپا لیا۔ اور آنکھ آنکھ کے گوشے سے دیکھ رہی تھی۔

میں نے کیفیت سُنائی کہ کس طرح ایک ریلوے بابو میرے پیچھے کئی اسٹیشن سے پڑا ہوا ہے اور گھس آیا ہوتا۔

"آپ کون ہیں؟ آپ کا ٹکٹ!"

میں نے اپنا پاس دکھایا اور بتایا کہ میرے میاں ایسٹ برانچ میں ٹکٹ چیکر ہیں۔ اُنہوں نے میرا پاس ہاتھ میں لیکر دیکھا۔

"آپ علی مرزا کی بیوی ہیں؟ ہاں میں اُن کو جانتا ہوں۔"

"جی ہاں!"

"وہ کون شخص تھا؟ کیا آپ اُس کو پہچان سکتی ہیں؟"

"وہ ......" میں نے اُنگلی سے بتا کر کہا۔ "وہ ..... دیکھئے ..... وہ کھڑا ہے۔"

"کدھر؟"

اور وہ دس بارہ آدمیوں کے ہجوم سے نکل کر صاف نظر آیا۔ اسٹیشن ماسٹر

کے مُنہ سے نکلا۔" ہیں!"

اور اُنہوں نے پھر پاس کو دیکھا۔ اور پھر میری طرف۔ اور پوچھا آپ علی مرزا کی بیوی ہیں؟"

"جی ہاں۔"

"علی مرزا ٹکٹ چیکر الیسٹ برانچ۔ حسن مرزا صاحب ہیڈ کلرک۔"

"جی ہاں..... اُن کے لڑکے ہیں...."

"آپ ان کی بیوی ہیں....؟"

میں نے تنگ آ کر کہا۔" جی ہاں!"

ایک دم سے میں چونک پڑی جب انہوں نے کہا۔" علی مرزا تو یہی ہیں... کیا کہتی ہیں آپ! خوب!.... ارے مسٹر مرزا!"

میں نے جھٹ سے سر اندر کر لیا۔ ادھر سے وہ مسکراتے ہوئے بڑھے اور ادھر سے یہ، دونوں ملے۔ باتیں کیں۔ اور پھر دونوں حد درجہ سنجیدہ۔ قدرے پریشان۔ میرے ڈبے کی طرف آئے۔ میری حالت کا اندازہ لگانا آسان ہے۔ کیا یہ ممکن ہے! کیسے؟ یہ کیا بکتا ہے۔

"یہ تو کہتے ہیں آپ ان کی بیوی نہیں..... یہ کیا تماشہ!" اسٹیشن ماسٹر نے کہا۔

"یا میرے اللہ! یہ کون ہے؟"

"کوئی مشکوک عورت ہے..... میری بیوی کہاں!"

میرے حواس گم ہو چکے تھے۔ مگر صورت حال بہت نازک تھی۔ "یہ کون ہیں؟" میں نے گھبرا کر پوچھا۔ کہ ریل نے زور سے سیٹی دی۔..... جنکشن پر اس معاملہ کو ...... گھر گھر۔ گھر گھر..... پولیس..... گاڑی چل دی۔

"آپ ان کو نہیں جانتی ہیں نا؟"

"میں تو نہیں جانتی۔"

"اور آپ ان کی بیوی بنی پھرتی ہیں۔ خوب!"

"بالکل غلط" میں نے کہا۔ "میں تو علی مرزا صاحب کی بیوی ہوں۔ یہ کون ہیں؟" اُنہوں نے کہا۔ "میں تم کو جانتا بھی نہیں۔"

وہ بولے۔ "صاحب سینکڑوں مشکوک عورتیں اِدھر سے اُدھر جاتی ہیں۔ کوئی سنگین معاملہ....."

میں نے چیخ کر کہا۔ "یہ پاس میں کس کا نام موجود ہے..... میں اُن کی بیوی ہوں۔ بس اور میں ....."

"میرا نام موجود ہے۔"

"غلط"۔ میں نے کہا۔ "وہ تو اس طرف ہیں..... بالکل غلط..... جھوٹ!"

"یہ معاملہ سنگین معلوم ہوتا ہے..... آپ جائیں۔"

ہیں کانپتی ہوئی اپنی سیٹ پر ڈوب گئی۔ بدن سے پسینے کے فوارے چھوٹ
پڑے تھے۔ دل کی گھڑ گھڑاہٹ ایک خواب کی سی کیفیت معلوم دی۔ میں نے آنکھیں
بند کر لیں اور ساکت پڑی رہی۔

عمر میں یہ اپنی قسم کا خوفناک ترین تجربہ تھا۔ میری برداشت سے باہر!
عورتوں کے تنہا سفر کے خوفناک نتائج! بدمعاش اور آوارہ ریلوے ملازموں کے
قصے سب کے سب جو آئے دن اخباروں میں پڑھے اور سُنے تھے ایک ایک کر کے
میرے دماغ میں آنے لگے۔

پولیس والوں کو بھی ملا لیتے ہیں۔ کوئی انگریز افسر تو ہوگا۔ مجھے ہمت
سے کام لینا پڑیگا۔

اور میں یہ سوچ ہی رہی تھی کہ ایک دم سے کھڑکی پر آہٹ سی معلوم ہوئی۔
آنکھ کھولی ہے تو منہ سے ایک چیخ نکلی میں اُچھل پڑی۔ وہی شخص کھڑکی پکڑے
پائدان پر سے ہوکر اندر گھسا آتا تھا۔

چیخ کر میں نے کہا "نکل ..... نکل ....." اور زور سے دھکا دے کر ہاتھ
چلائی کہ اس کشمکش میں اُس کے داہنے ہاتھ کے کوٹ کی آستین مع قمیص کے اوپر
چڑھ گئی میرے اوپر بیچ بیچ ایک بجلی سی گری۔ اور میں جھٹ سے اپنی سیٹ پر چادر
اوڑھ کر کونے میں ہو گئی۔

"یا میرے اللہ! اب میں کیا کروں! عورتوں کے تنہا سفر کے خوفناک واقعات نے

دماغ ایسا پراگندہ کر دیا تھا کہ بتانے پر بھی شبہ ہوا۔ مجھے تو شاید فوراً ہی چلا جانا چاہیئے تھا۔

نکاح کے کچھ روز بعد ہی خسر صاحب آئے تھے تو معلوم ہوا تھا کہ ہاتھ میں چوٹ آ گئی ہے جس کے سبب بخار ہو گیا ہے۔ پھر والدہ صاحبہ نے رسمی خیریت لکھی کی تھی۔ اس کے تیسرے چوتھے روز میری ایک سہیلی نے بتایا کہ چوٹ کچھ نہیں آئی تھی بلکہ کلائی پر میرا نام رنگین حروف میں گدوایا تھا وہ پک گیا جس کے سبب بخار آ گیا تو اوپر کپڑا لپیٹا ہے۔ کسی کو معلوم نہیں۔ اور اس وقت جو میں آستین سرکی تو میں نے دیکھا! خیر۔ اب ان باتوں کے سوچنے کی فرصت کہاں!

(۴۷)

"آپ علی مرزا کو جانتی ہیں! ...... بیچارے اچھے آدمی ہیں۔ ... آپ اُن کی بیوی ہیں! معاف کیجئے گا۔ بندہ پرور!"

میں نے ہاتھ چھڑاتے ہوئے کہا: "یہ کوئی طریقہ نہیں ہے۔"

"تو سیدھی بیٹھو اسٹیشن آ رہا ہے۔ مجھے یہ حماقتیں پسند نہیں ہیں ...... ابھی تو لڑ رہی تھیں اور مجھے دھکیل کر مار ڈالا ہوتا ..... پہچانا نہیں آپ نے ..... ضرور ..... مجھے بہت سی باتیں کرنا ہیں۔"

"کیا باتیں کرنا ہیں؟ ..... کیجئے نا ......"

اور ہم نے ضروری باتیں شروع کیں۔ وہ باتیں جن کے بغیر کام اٹکے

پڑے تھے۔ نہایت اہم معاملات۔ خطوں کے جواب نہیں دیئے۔ بڑے ضروری خط تھے۔ میری دانست میں پہلی ہی ملاقات میں مرد عورت کو اپنی حماقتوں سے قائل کر دیتا ہے۔

معلوم ہوا کہ اس گاڑی کا ٹکٹ چیکر رخصت پر تھا۔ چھٹی پر آئے تھے اور ان کے دن بالا ہی بالا عین وقت پر اپنے نام ریلیونگ کے احکام جاری کرائے اور بین اسٹیشن پہلے حد ختم ہو گئی۔ اب اگلے جنکشن سے فوراً ہی دوسری گاڑی میں واپس جانا ہوگا۔ وہ تیار ہی کھڑی ہوگی۔ طے یہ ہوا کہ ڈیننگ روم میں کچھ دیر باتیں اور کریں گے۔ میں نے بہت چاہا کہ ایسا نہ ہو مگر نہ مانے اور اس طرح کہا کہ مجبور ہونا پڑا۔

باتوں میں وقت جلدی گذر گیا اور جنکشن آگیا۔ اسٹیشن آنے سے پہلے ہی وہ پائیدان پر سے ہو کر برابر کے ڈبے میں چلے گئے۔

گاڑی رکتے ہی آئے اور مجھے لیجا کر ڈیننگ روم میں بٹھا دیا۔ کوئی بھی نہ تھا۔ جو مسافر تھے وہ سب گاڑی پر پہنچے تھے۔ ایک قلی میرا اسباب دیکھنے پر مقرر کر دیا۔

ایسے موقع پر بھلا میں کیا باتیں کرتی۔ دھیان گاڑی کی طرف لگا۔ مجھے بے چین دیکھکر کہنے لگے کہ گاڑی تو بڑی دیر میں چھوٹے گی۔ میں نے کہا۔ بڑی دیر تو نہیں ہو سکتی۔ اور پھر جانے کو کہا اور اجازت چاہی۔ تو پھر یہی کہا کہ گاڑی چھوٹنے

میں بڑی دیر ہے۔ اور ڈبہ تو سامنے ہی تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں ریل نے سیٹی دی۔ ہم دونوں اُٹھے۔ میں جلدی سے برقعہ سنبھال کر تیزی سے ڈبے پر پہنچی۔
اُنہوں نے ہینڈل پکڑ کر جو گھمایا تو گھومتا نہیں۔ معلوم ہوا کہ کوئی چابی دے گیا ہے۔ ریل نے اور سیٹی دی۔ چابی ڈھونڈتے ہیں کہ ریل نے آخری سیٹی دی۔ کہ جھپٹ کر آگے گئے۔ پہنچے ہیں کہ گاڑی جنبش میں آگئی۔ کھڑکی میں جھٹ سے چابی لگائی اور وہ کھلی بھی ہے تو کب کہ میرے لئے اس پر بیٹھنا باوجود ہر کوشش کے ناممکن ہوا۔ اسباب! میں عرض نہیں کرسکتی کہ کیسی پریشانی ہوئی۔ مڑ کر جو دیکھتی ہوں تو ویٹنگ روم کے دروازے کے سہارے میرا اسباب رکھا ہوا ہے۔
اسے اٹھانے بھی ندارد! ویٹنگ روم میں جو آئی تو حقیقت آشکارا ہوئی۔
میں نے گھبرا کر کہا "یہ کوئی طریقہ نہیں ہے۔ وہاں تار دیا گیا ہے۔ سکول کی عورت آئی ہوگی۔ غضب ہوگیا۔"
ہنس کر کہنے لگے "میں کیا کروں ۔ ۔ ۔ ۔ مجھے خود اپنی ٹرین پر جانا ہے۔"
اتنے میں کیا دیکھتی ہوں کہ ہوٹل کا خانساماں کھانا لئے چلا آرہا ہے۔
میں نے جل کر کہا۔ "میں نہیں کھاؤں گی۔ آپ نے میری گاڑی چھٹوادی۔"
لیکن وہاں سوائے ایک دلچسپ مسکراہٹ کے جواب ندارد۔ جب میں بہت گھبرائی تو آخر تنگ آکر کہا کہ "اچھا صاحب جان بوجھ کر روک لیا ہے۔ کرلو جو جی آئے۔ جی میں آئے جیسے تم دیدہ۔ بلوا لو۔"

میں بڑی دیر تک پریشان بیٹھی رہی۔ آخرش مجھے گھسیٹا "لاؤ منہ دھلادوں ......" اور چلو میں پانی لیکر میرا منہ دھلا دیا۔

"ارے۔ ارے ....ارے" میں نے اپنا منہ بچاتے ہوئے بمشکل چھڑایا۔ کہ آپ اپنا منہ دھولونگی۔ آپ رہنے دیجئے ...." ہم دونوں نے منہ ہاتھ دھویا اور پھر کھانے پر آئے۔ انگریزی مٹھائیاں، کیک، پڈنگ، کباب، پراٹھے، کٹ لٹ، الا بلا بہت زیادہ کھانا موجود تھا۔ کھانا شروع کرنا پڑا۔ میرے لئے کس قدر مشکل تھا بیان نہیں کرسکتی کھانے میں کس قدر تکلف محسوس کیا ہے۔

اب دوسری گاڑی صبح چار بجے جاتی تھی۔ جب تک کیا کریں۔ کہنے لگے چلو شہر گھومیں، سنیما دیکھیں گے۔ مُردہ بدست زندہ۔

کھانے کے بعد تانگہ لیا۔ بُرقعہ الگ پھینکا۔ اور ہم دونوں شہر کی سیر کو چلے۔

بازار میں پہنچے۔ کپڑے والوں کی دُکان پر اُترے۔ ساڑھیاں خریدنا پڑیں صابون، پاؤڈر، آئینہ، کنگھا، فیس کریم، عطر، رومال، اٹاچی کیس، جوتے موزے، سوٹ کیس وغیرہ وغیرہ کوئی سو روپے پر پانی پھیر دیا۔ میں نے بھی سوچا چلو ٹھیک ہے۔ میاں دلاتا ہے کیا مضائقہ ہے۔ یہ سب چیزیں سوٹ کیس میں رکھکر ایک ہوٹل میں پہنچے۔ میں تانگے میں رہی اور وہ سوٹ کیس رکھا کر جلد ہی واپس آگئے۔

وہاں سے سنیما گئے۔ بارہ بجے وہاں سے جو چھوٹے تو ہوٹل پر آئے۔ کہا "اترو"

معلوم ہوا اسٹیشن نہیں جا سکتے اِس لئے کہ اگر اسٹیشن ماسٹر نے دیکھ لیا تو غضب ہو جائیگا۔ اپنی ڈیوٹی سے مفرور ہیں۔ اب بقیہ رات کہاں کاٹیں۔

ہم دونوں وہیں ہوٹل میں رہے۔ کمرہ پہلے سے طے کر کے اُس میں سوٹ کیس رکھ گئے تھے۔

صبح کی گاڑی سے ہم روانہ ہوگئے۔ اسٹیشن پر چوروں کی طرح آئے اور مجھے خود بٹھا بھی نہ سکے کہ کوئی دیکھ نہ لے۔ میں نے کہدیا تھا کہ اسکول والوں کو تار دیدینا کہ گاڑی چھوٹ گئی تھی۔

اسکول پہنچی تو بڑی آفت آئی۔ پوچھا گیا، رہ کیسے گئیں جب گاڑی نہیں بدلتی تھی۔ کہا دھوکے سے اُتر گئی۔ رات بھر پلیٹ فارم پر بیٹھی رہی۔ فوراً ہی تار نہیں دیا۔ غلطی سمجھو۔ بات گئی گذری ہوئی۔

امتحان کا زمانہ قریب آیا کہ میں بیمار پڑی۔ بہت زیادہ بیمار پڑی۔ علاج ہوا۔ خدا کی مرضی تھی کہ آفت میں پڑوں۔ سب کچھ بتانا پڑا۔ میاں کے ساتھ رہ گئی تھی۔ ہوٹل میں ٹھہری تھی۔

اسکول والوں نے پہلے یک طرفہ تحقیقات کرائی تو یہ معلوم ہوا کہ ہوٹل میں کسی اور کے ساتھ ٹھہری تھی۔ غلام محمد مع اپنی بیوی کے آیا۔ آگرہ کا رہنے والا، سوٹ کیس رکھ گیا پھر بیوی کو لایا۔ ہوٹل کے رجسٹر میں دستخط موجود۔ ریلوے سے

معلوم ہوا کہ علی مرزا ٹکٹ چیکر شام ہی کو اپنی گاڑی لیکر لوٹ گیا۔ ہوٹل میں غلط نام لکھایا تھا۔

اسکول والوں نے پھر کچھ بھی نہ پوچھا۔ نہ کہا نہ سُنا۔ میرے گھر تار دیدیا کہ بیمار ہے جلدی لیجاؤ۔ اور اسکول سے نام خارج کر دیا۔ وہاں سے پاس آنے میں دیر ہوئی تو مجھے گاڑی میں بٹھا کر، ٹکٹ دلا کر اسکول کی ملازمہ کے ساتھ گھر بھجوا دیا۔ اسکول کی ملازمہ نے گھر پر ایک لفظ نہ کہا۔ اور ایک وقت نہ ٹھہری۔

میں نے ایک خط مرزا صاحب کو لکھا کہ کیا آفت آئی ہے۔ ایک خط پہلے ہی لکھ چکی تھی۔ مگر جواب ندارد۔

تھوڑے ہی دن بعد ایک دم سے رُخصت اور شادی ہوگئی۔ خوب ذلت اور رُسوائی کے ساتھ۔ مگر غنیمت ہوا کہ فوراً ہی مجھے اپنے ساتھ اپنے ہیڈ کوارٹر پر لے گئے۔ اور وہیں اللہ نے اپنی مہربانیوں کا نزول کیا۔ دو جُڑواں لڑکے پیدا ہوئے اور میری مُصیبتوں کا آغاز ہوا۔ میاں تھے کہ ایک دیوانہ وار عاشق۔ صورت شکل بیشک میری ایسی تھی کہ ہزاروں میں ایک۔ مجھے ناز تھا۔ میرا پیارا شوہر میری صورت شکل پر دیوانہ تھا، یہ میرے لئے کس قدر باعث فخر تھا۔ جس محفل میں جاتی تارے کی طرح چمکتی ہوئی۔ ہر بیوی کی نظر ہے کہ مجھ پر۔ میری خوبصورتی اور حُسن بے پناہ میرے شوہر کے دوستوں میں نہیں بلکہ غیروں تک میں ضرب المثل ہوگیا۔ اور میری جوانی اور خوبصورتی ایک افسانہ کی ہیروئن کی طرح مشہور ہوگئی۔

(۴)

پانچ سال جیسے پلک مارتے گذر گئے۔ ایک لڑکی ہوئی اور پھر تو یہ آفت کہ ایک گود میں دو پیٹ میں یا دو گود میں ایک پیٹ میں۔ چھ سال میں نو بچے ہوئے جس میں سے دو مر گئے سات موجود اور آٹھویں کا ڈر۔ شوہر نے زندگی تلخ کر دی۔ وہی پاگل پن، وہی جنون۔ بچے روکنے کی ہر کوشش ناکام۔ الٰہی یہ آفت کیسے رُکے۔

شوہر ساتھ نہیں چھوڑتے۔ چار دن میکے میں نہ رہنے دیں۔ اپنے گھر نہ رہنے دیں۔ جھگڑے ہونے لگے۔ لڑائیاں ہونے لگیں۔ پریشانیاں بڑھ گئیں۔ بچوں کی بیماری گھر کا کام اور میاں کو نہ بچوں سے مطلب نہ گھر سے۔ بس مجھ سے سروکار۔ بس بچے دیئے جاؤں۔ تلخیاں بڑھتی گئیں سخت لڑائی ہے۔ بات چیت بند ہے۔ دلوں میں سخت کدورت ہے۔ رنجش ہے ایک دوسرے کی صورت سے نفرت ہے۔ مگر۔۔۔ مگر۔۔۔

اور میں سر پیٹ لیتی! خدا کی پناہ! اس خونخوار شوہر سے بچا! اس درندے سے! اس حیوان سے جس کو دنیا میں سوائے ایک کام کے اور کچھ نہیں۔ میری تکلیف، میری مصیبتوں، بچوں کی بیماری، کسی چیز سے اسے سروکار نہیں۔

وہ پہلی بار ریل میں ملنا یاد ہے۔ وہ جوشِ محبت، غضب ہے خدا کا اب بھی وہی! بلکہ سو درجہ زائد! مجھے موت نہیں آتی۔ بچے بوٹیاں نوچتے ہیں۔ نہ دن چین نہ رات چین اور بچے ہیں کہ چلے آ رہے ہیں!

ایک اور ریلوے گارڈ نئے آئے۔ اُن کی بیوی بھی اسی مصیبت میں گرفتار تھیں۔ چھ سال میں سات بچے ہوئے۔ چھ موجود، ساتویں کا ڈر۔ مجھ سے زیادہ سمجھدار اور عقلمند تھیں لیکن ہر کوشش بے سُود تھی۔ اب ایک مشہور ڈاکٹرنی کے علاج کا ارادہ تھا۔ میں نے کہا بہن میں بھی چلونگی۔

اب ہم مغربی برانچ میں تھے۔ ہیڈکوارٹر شہر تھا۔ ہر قسم کی عورتوں سے ملنے کے موقعے ملتے تھے۔

ہم دونوں ڈاکٹر صاحبہ کے پاس گئے۔ انہوں نے جتنی ترکیبیں بتائیں سب بیکار اور بے سُود ثابت ہو چکی تھیں۔ ہماری غلطی ہی سہی اور نئی غلطی ایک بچہ رکھ لو۔

کہنے لگیں "آپ لوگوں کو پروا نہیں ہے۔ شوہروں سے بالکل الگ رہیں ورنہ دوسری خطرناک بیماریاں لگ جائیں گی"۔ ان کو سمجھایا کہ بچے پیدا ہونے کی بیماری سے زیادہ خطرناک اور کوئی بیماری نہیں ہے۔ مگر چونکہ خود یہ کنواری تھیں لہذا ان کی سمجھ ہم سے بہت زیادہ تھی۔ نتیجہ یہ کہ ہم دونوں بے نیل و مرام واپس آئے۔ "شوہروں سے علیحدگی رکھو" یہ دوا تو ہم بھی جانتے تھے۔ "ذرا شوہر کر کے دیکھو"

یاس و نا امیدی تھی کہ ایکدم سے صورت حال بدل گئی۔ واہ واہ۔ کیا کہنے ہیں۔ گارڈ صاحب کی بیوی کے یہاں ایک رسالہ آتا تھا۔ اُس میں یورپ کے مشہور افسانہ نویس "موپساں" کا افسانہ تھا۔

اور دیکھو۔ ایک ہمارے افسانہ نویس ہیں کہ ملک و قوم کی اصلاح اُن سے

نہیں ہوتی۔ موپساں کے افسانے نے ہماری مشکل حل کر دی۔ اس پر ہم بھی عمل کریں وہ افسانہ کیا تھا۔ یہ لیجئے :۔

موپساں کا افسانہ

ہماری ہی طرح ایک عورت بچّوں کی مصیبت میں گرفتار تھی۔ ہر سال ایک بچّہ لے لو۔ ہم سے زیادہ تنگ آچکی تھی۔ اور ایک روز کا ذکر ہے کہ :۔

"اُس نے دستِ شوق آگے بڑھایا اور شانے کو اس طرح چھو گیا جیسے اتفاقاً ہاتھ لگ گیا ہو۔ وہ اس انداز سے سمٹ گئی جیسے اُسے بھاری خطرے کا احساس ہو گیا ہو۔

"بیگم!"

"کیا چاہتے ہیں آپ ؟"

"تم بہت خوبصورت ہو۔"

بیگم نے کوئی جواب نہیں دیا، وہ اپنی کرسی پر دراز ہو گئی جیسے کوئی شہزادی افسردہ ہو گئی ہو۔

"کبھی کبھی جی چاہتا ہے کہ تمہاری پرستش کی جائے۔ آج تم بہت خوبصورت ہو، بہت۔"

"میری بدقسمتی۔"

"تمہاری، کیا؟"

میری بدقسمتی، بدنصیبی، اور یہ بھی سُن لیجئے کہ اب مجھے آپ سے کوئی سروکار نہ ہوگا۔"

شوہر ہمیشہ سے زیادہ متعجب تھا اور کسی قدر مجروح بھی۔ "کیا مطلب ہے تمہارا؟" وہ جھلّایا۔

"کیا مطلب ہے میرا سمجھے نہیں؟" بیگم بھی تیز ہوگئی تھی۔ اس نے ایک ایک لفظ پر زور دیکر کہا۔ "اب پھر تم، ہاں میں "تم" ہی کہونگی، اپنی پرانی چالوں پر آگئے ہو!"

مارے حیرت کے اُس کا چہرہ فق ہوگیا۔

وہ تندرست اور خوبصورت جوان تھا۔ اور عام طور پر ایک بہتر شوہر اور بہترین باپ تصوّر کیا جاتا تھا۔ "لیکن بات کیا ہے؟"

"بات سچّی ہے۔" وہ جوش میں آگئی تھی۔

"آج میں کسی سے نہیں ڈروں گی۔ خصوصاً تم سے۔ یاد کرو۔" وہ پھٹ پڑی۔ آٹھ سال سے زندگی کے اس عذاب کو بُھگت رہی ہوں۔ لیکن اب یہ ناقابل برداشت ہوگیا ہے۔ اِس بوجھ کو جسے تم نے زبردستی لادا ہے اور جس کے نیچے میں پسی جا رہی ہوں، اُتار پھینکنا چاہتی ہوں۔ میری سماجی حیثیت، میری شخصیت، میرے جوبن، میری صحت کون سی چیز پر تم نے ڈاکہ نہیں ڈالا۔

وہ دوبارہ زرد پڑ گیا۔

"میں نہیں جانتا کہ تم کیا چاہتی ہو؟"

"تم جانتے ہو! تمہارے ارادے، تمہارے خطرناک ارادے عورت کی زندگی کیلئے ایک مستقل خطرہ ہیں۔ تین مہینے، صرف تین مہینے پہلے میرے آخری بچہ ہوا تھا۔ تمہاری مخالفانہ جدوجہد کے باوجود حتی الامکان اپنی صحت اور جیسا کہ تم نے ابھی کہا تھا، اپنی خوبصورتی قائم رکھنے میں کامیاب ہوں اور اب۔ . . . تمہارے خیال میں پھر ابتدا کرنے کا وقت آ گیا ہے۔"

"پاگل تو نہیں ہوئی ہو؟"

"بالکل نہیں! آٹھ سال پہلے ہماری شادی ہوئی تھی۔ اس وقت ہمارے سات بچے ہیں۔ اور تم مزید دس سال تک غالباً اسی رفتار سے چلنا چاہتے ہو۔ جس کے بعد دنیا کے عام قاعدے کے مطابق مجھے سپرد خاک کر کے تم حج کو چلے جاؤ گے۔"

اس نے کسی قدر بیدردی سے اس کا بازو پکڑا۔

"دیوانی ہوتی ہو؟"

"ابھی تک تو نہیں ہوئی، لیکن ہو جاؤنگی۔"

"میں تم سے ایسی باتیں سننا نہیں چاہتا۔"

"ہر سال تمہاری سوچی ہوئی تدبیر کے خلاف میں بھرہ رعنائی "زچہ خانے" سے واپس ہوتی۔ اور اس تمنا کے ساتھ واپس ہوتی کہ کچھ دن امن چین سے گذارونگی

لیکن پھر تم پھر جلنے لگتے۔ تمہارے نفس کے جہنم میں آتش و بارود کا ایک طوفان اُٹھتا اور مجھے سزا ملنی شروع ہو جاتی۔"

"تم مجھے مذہبی عورت سمجھتے ہو؟" ۔ بیوی نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"ہاں کیوں؟"

"اور اس کا بھی تمہیں یقین ہے کہ میں خدا اور اس کی کتاب کو مانتی ہوں؟"

"ہاں ہاں۔"

"کیا میں خدا کو گواہ کر کے کتاب پاک کی کبھی جھوٹی قسم کھا سکوں گی۔"

"غالباً نہیں۔"

"ذری دیر کے لئے میرے کمرے تک چلو گے؟"

"کیوں؟"

"معلوم ہو جائے گا۔ چلو گے؟"

"اچھا ۔ اگر ایسا ہی ضروری ہے۔"

ملکوتی نظارہ تھا۔ وہ اپنے دونوں ہاتھوں سے صحیفۂ آسمانی تھامے ہوئے جانماز پر قبلہ رو بیٹھی تھی اسکے بدن پر لرزش طاری تھی۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ وہ سسکیوں کے طوفان میں گھر گئی ہے۔ جب کافی دیر ہو گئی تو شوہر نے آگے بڑھ کر اسکے شانے کو چھوا۔ وہ ایک دفعہ کانپ گئی۔ پھر انتہائی رقت کے ساتھ کہنا شروع کیا:-

"میرے معبود! تیری زمین کی پہنائیاں، تیری دنیا کی وسعتیں مجھ پر تنگ کر دی گئی ہیں۔ وہ جابر و قادر ہیں لاچار و مجبور، میرے قدم ڈگمگا رہے ہیں۔ مجھے استقامت دے اور چلنے کی طاقت —— میری کمزوریاں —— ایک عورت کی کمزوریاں اپنی آپ سزا ہیں —— تمہارے "۔ اُس نے شوہر کو مخاطب کرتے ہوئے سلسلہ کلام جاری رکھا۔
"تمہارے سات بچے ہیں۔ آج خدا کے حضور میں کھڑی اور اُس کے کلام کی قسم کھا کر کہتی ہوں کہ ان میں سے ایک بچہ تمہارا نہیں ہے۔ وہ کون سا بچہ ہے یہ تمہیں کبھی معلوم نہ ہو گا —— میں نے اپنے آپ کو جس شخص کے حوالے کیا تھا اُس سے مجھے محبت تو کیا اُنس بھی نہ تھا۔ محض انتقام کی خاطر، بدلہ لینے کے واسطے میں نے اپنا جسم ایک اجنبی کے سپرد کیا تھا۔
اب تم ساری دنیا کو مشتبہ سمجھ لو۔ لیکن تمہیں کبھی یہ معلوم نہ ہو گا کہ وہ کون تھا۔
میں عزم گناہ لیکر نہیں آئی اور نہ گناہوں کا کفارہ دینے آئی ہوں۔ مجھے جو کچھ کرنا تھا وہ کر چکی اور اب اس پر تلافی نہیں پچھتاتی —— تم اس طرح میری طرف آنکھیں پھاڑ کر کیا دیکھ رہے ہو، کیا مجھے مار ڈالو گے؟ نہیں تم ایسا نہیں کر سکتے۔ تم مہذب ہو۔ تعلیم یافتہ ہو اونچی کرسیوں پر بیٹھتے ہو۔ تمہاری رگوں میں مہذب خون ہے، تم کو اپنے ناموس سے زیادہ تہذیب کا پاس ہونا چاہیئے۔ ایسی باتوں پہ جاہل اور گنوار کٹ مرتے ہیں —— آؤ ہم مہذب، اس معاملہ کو یوں طے کر لیں۔ طلاق نہ خلع، صرف مستقل علیحدگی۔ نہ تہذیب پر کوئی خطرہ نہ عزت پر کوئی آنچ۔"

وہ ہر گزرنے والے لمحہ میں اپنے گلے کے قریب مضبوط سخت انگلیوں کی گرفت کا

انتظار کر رہی تھی۔ کم کم ایک تیز اور سخت گھونسے کی اسے بہر حال توقع تھی۔ لیکن لمحات بدستور خاموشی کے ساتھ گذرتے گئے۔ اور وہ ـــــ دفعتاً کمرے سے باہر نکل گیا۔

کس قدر مہذب انسان!

بیگم کا ایک اندیشہ بالکل غلط نکلا۔ اور دوسرا بالکل صحیح۔

وہ ایک عذاب میں مبتلا ہو گیا تھا۔ اس کے بچے اُسے بہت عزیز تھے۔ بیگم سمجھ نہ سکی شاید اُنہیں سمجھ ہی نہیں سکتیں کہ ایک باپ کو اپنے بچّوں سے کس قدر محبّت ہو سکتی ہے۔ لیکن ایک بچہ اس کا نہیں ہے۔ یہ کس قدر المناک حقیقت تھی۔

وہ گھر چھوڑ رہا تھا، شہر چھوڑ رہا تھا، لوگ کہتے ہیں وہ ایک طویل سفر پر جا رہا ہے کام کی یکسانیت سے اُکتا کر، مسلسل مصروفیت سے گھبرا کر جس طرح ہر بڑے آدمی کا دستور ہے۔

ازدواج کو زندگی کا ایک "لطیف حادثہ" تصوّر کیا جاتا ہے جو میرے خیال میں صحیح نہیں ہے۔ زندگی "ہجوم حوادث" کا دوسرا نام ہے۔ اگر حادثات زندگی سے ازدواجی ممکنات خارج کر دیئے جائیں تو ساری زندگی ایک "سکون مطلق" ہو جائے۔

لوگ ہنگاموں کو "گھر کی رونق" سمجھتے ہیں اور سکوت کو "خانہ ویرانی"۔ لیکن میں سکون کا متلاشی ہوں، دل سکوت کی جستجو کر رہا ہے۔ مجھے حرکت سے نفرت ہو گئی ہے جو جنبش کرتی ہو ـــــ مجھے اس دنیا سے، اس کے چاند اور ستاروں سے۔ راتوں کی تاریکی سے، دن کے اُجالے سے نفر ہو گیا ہے کہ یہ سب گردش کرتے ہیں۔ میں پہاڑوں کے جمود پر دریا کی روانی قربان کرتا ہوں اور آبادی کے ہنگاموں کو ویرانے کی خموشی پر نثار ا بلکہ

مجھے تو اب اپنے قلب کی دھڑکن سے بھی وحشت ہونے لگی ہے۔

لوگ کہتے ہیں حرکت میں برکت ہے۔ میں کہتا ہوں حرکت موت ہے۔ حرکت سے کسی کے عضویات میں طاقت نہیں پہنچتی بلکہ وہ بقدر حرکت موت کی طرف بڑھتا اور فنا کی طرح کھنچتا ہے۔ ذرا ہماری آس پاس کی چیزوں پر غور کرو۔ پتھر گھس گھس کر فنا ہو جاتا ہے۔ پانی گرم ہو کر فضا میں مل جاتا ہے، شرارے اپنی جگہ سے جنبش کرتے ہیں موت کے منہ میں چلے جاتے ہیں۔ پتھر اپنی جگہ ساکن، پانی منجمد اور شرار سینہ سنگ نہ چھوڑتا تو یقیناً ان کی زندگی طویل ہو جاتی وہ عمر خضر پاتے تم جس قدر غور کرو گے اتنا ہی حقیقت سے قریب ہوتے جاؤ گے۔ اگر آج دنیا ساکن ہو جائے تو کیا ہو گا؟ انسان وہ سب کچھ پائے گا جو اب پا نہیں سکتا۔ اور منشا ایزدی پورا ہو جائے گا۔

انسان نے خدا سے بغاوت کی یہ ہو سکتا تھا کہ اُسے جہنّم میں پھینک دیا جاتا۔ خلائے عظیم میں ہمیشہ کے لئے گم کر دیا جاتا، لیکن مشیت اسے انتہائی سزا دینا چاہتی تھی۔ اسے کرۂ ارض پر پھینک دیا گیا۔ جس کے ایک ایک ذرّے کے دامن میں سو سو جہنّم چھپے ہوئے ہیں۔

یہ دُنیا، جسے اب ہم ہماری دنیا کہنے کے عادی ہو گئے ہیں قطعی ہماری نہیں ہے۔ کم از کم ہمارے لئے نہیں بنائی گئی ہے۔ یہاں کے جمادات اور نباتات، یہاں کے موسم و سال، یہاں کی آب و ہوا اور یہاں کے سارے طبعی تغیرات انسان کیلئے کس قدر غیر

موزوں اور حیوانوں کے لئے کس قدر مناسب ہیں۔

پہاڑوں کے غار، جنگلوں کے کچھار اور دشت وصحرا کی تعمیر کے بعد قدرت کا کام ختم ہو جاتا ہے۔ گویا قدرت نے آسائش مخلوق کیلئے محل اور کاشانے تعمیر کر دیئے، انسان غاروں اور جنگلوں میں مارا مارا پھرتا ہے۔ دشت وصحرا کی خاک چھانتا ہے اس کو کہیں امان نہیں ملتی۔ وہ مجبوراً پہاڑوں پہ ڈاکہ ڈالتا ہے۔ جنگلوں کو لوٹ لیتا ہے اور اس مالِ غنیمت سے جو کچھ پتھر، مٹی اور لکڑی پر مشتمل ہوتا ہے اپنے رہنے کے لئے بڑی محنت اور جانفشانی سے ایک حقیر مسکن تیار کر لیتا ہے۔

وہ چھ سال کے عرصے میں بہت بڑا شاعر ہو گیا تھا۔ بہت بڑا فلسفی ہو گیا تھا۔ بین الاقوامی شہرت کا مالک ہو گیا تھا۔ اس کے جدید نظریوں سے دنیا تہہ و بالا ہو رہی تھی۔ اور اس چھ سال کے عرصے میں اس کے اعتقادات کے لحاظ سے دنیا چھ سو سال آگے بڑھ گئی تھی۔ مگر وہ اپنی جگہ سے نہ ہلا۔ اس کا "دماغ" فضل و کمال کی برکت سے آسودہ اور "دل" فقدان وسکون سے مضطرب، اس کے دماغ سے دلائل و براہین کا ایک سیلاب دل کی تسکین کے لئے بڑھتا اور دل بیک جنبش اس کو رد کر دیتا۔ وہ کبھی سوچتا کہ قدرت اس کے ساتھ تمسخر کر رہی ہے اور ساری دنیا کسی نامعلوم مقصد کیلئے اس کے خلاف سازش کر رہی ہے، جس میں اسکی بیوی اور بچے بھی شامل ہیں۔

"بچے؟ یعنی میرے بچے، یعنی بچے۔"

"کون کہہ سکتا ہے کہ کون سا بچہ کس کا ہے ؟"

آج وہ پورے چھ سال بعد پہلی اور آخری مرتبہ گھر جا رہا تھا اور اس ارادے کے ساتھ کہ یا تو کانٹے کو نکال کر رہے گا یا اس حصۂ جسم کو کاٹ کر پھینک دیگا۔

ملکوتی نظّارہ تھا، بیگم اپنے دونوں ہاتھوں سے صحیفۂ آسمانی تھامے ہوئے جانماز پر قبلہ رو بیٹھی ہوئی تھی "میرے معبود!" اُس نے ابتدا کی "میں درماندہ ہو رہی تھی۔ تو نے مجھے استقامت عطا کی اور چلنے کی طاقت بخشی۔ آج میں منزل پر پہنچ گئی ہوں۔ اب میرا سفر ختم ہوتا ہے اور تم!" اس نے شوہر کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ تم سُن رہے ہو! آج میں ہمیشہ سے زیادہ عقیدت و ارادت کے ساتھ خدائے برتر و بزرگ کی قسم کھا کر کہتی ہوں کہ میں نے چھ سال پہلے جھوٹی قسم کھائی تھی۔"

"بیگم" وہ پکار اُٹھا

"اگر میں ایسا نہ کرتی تو اس چھ سال کے عرصے میں اور چھ بچے مجھ پر لد جاتے ——— لیکن یہ تھا" ضبطِ تولید کا ایک تیر بہدف نسخہ"

"لیکن کس قدر خطرناک"

"ایک درجن بچوں سے زیادہ خطرناک تو نہیں"

اس نے اطمینان کا ایک گہرا سانس لیا۔ واقعی اسے سکون ہو گیا تھا۔ ایسا سکون جو ساری دُنیا کے علوم نہ دے سکے، اور ایک عورت نے دیدیا۔"

یہ تھا موپاساں کا وہ افسانہ جس کو ہم دونوں نے غور سے پڑھا۔ حرف بحرف ہمارے حسب حال تھا۔

"ماہر نفسیات ہے۔" وہ بولیں۔ "دیکھ لو نا کیسی ترکیبیں بتاتا ہے۔"

مگر ایک مشکل تھی۔ ہم دونوں کے میاں فلاسفر ہو جائیں گے، شاعر ہو جائینگے۔ اور چھوڑ کر بھاگنے سے نوکریاں جاتی رہیں گی۔

"اے آ گیا نا چھ سال پیچھے۔ جائیں گے کہاں۔"

"نوکری تو چھوٹ جائیگی۔" میں نے کہا۔

اور ہم دونوں نے اس مسئلہ پر غور کرنا شروع کیا۔ فرض کرو آج نوکری چھوٹ گئی میاں نکل گئے۔ میری گزر اوقات تو مشکل نہ تھی۔ روپے والے ہر سر روزگار خسر موجود۔ گھر، مکان، زر، زیور موجود۔ آپ کھلائیں گے پوتوں کو۔ گارڈ کی بیوی کے پاس بھی مکان، زیور تھا۔ کچھ روپیہ بھی۔ مگر ایسی صورت نہیں تھی۔ لیکن واپسی پر نوکری ملے گی یا نہیں۔ یہ بات پوچھنا ہے۔

کئی عورتوں سے پوچھا۔ پھر خود انہی سے پوچھا۔ معلوم ہوا کہ کوئی بیمار ہو جائے تو رشتہ دار چھٹی کی عرضی دیدیں قطعی نوکری برقرار رہیگی۔ ڈاکٹر سرٹیفکٹ دیدیگا۔ گارڈ صاحب نے کہا ایسا نہیں ہوگا، نوکری جاتی رہے گی۔

اور یہ سوالات زیر بحث ہی تھے کہ ان بے رحم شوہروں نے وہ حال کر دیا کہ موت منظور۔ بلا سے نوکری جائے۔ بھیک مانگ کھائیں۔

اس بات کو ہم نے بالکل بصیغۂ راز رکھا۔ اس لئے کہ اگر یہ بات کھل گئی تو پھر یہ آخری نسخہ بھی بیکار۔ افسانہ کو بار بار پڑھا۔ خوب رٹ لیا۔ جیسے ڈرامہ رٹتے ہیں۔ خوب خوب ایکٹنگ کیا اور خوب مشق کی۔ اور آخر کار طے کر کے ایک ہی دن، قریب قریب ایک ہی وقت اس پر عمل کر ڈالا۔

ڈیوٹی سے رات کو آئے تھے۔ خود اپنی طرف سے ذرا سا اشارہ کرنے سے کام چل گیا۔ پہلے تو یقین نہ ہوا لیکن جب قسم کھانے کا پورا ڈرامہ مکمل ہو گیا تو ایک سناٹے میں آگئے۔ پھر ایک جوش کے ساتھ قسمیں دیں اور میں نے اس سے دس گنے جوش کے ساتھ جو قسمیں کھائی ہیں تو مکمل شکست دی۔ برسوں کے مظالم کا بدلہ تھا۔ ایک شکست خوردہ شوہر۔

صبح اٹھکر بے کھائے پیئے چل دیئے۔ میں چپکی پڑی رہی۔ گئے، اب دیکھو کب لوٹیں گے۔ اور گارڈ صاحب کی بیوی بھی آئیں۔ وہاں بھی یہی معاملہ ہوا۔ ہو بہو۔

دو روز غائب رہے۔ تیسرے روز کیا دیکھتی ہوں کہ واپس چلے آرہے ہیں۔ کوئی بات چیت نہیں ہوئی۔ چپ چاپ پڑ رہے۔

رات کا ایک بجا ہوگا۔ بچے سب سوتے تھے۔ اٹھے۔ مجھے ایک علیحدہ کمرے میں بلایا۔ اور قسم دیکر پوچھا۔ "دیکھو سچ سچ بتاؤ۔"

میں نے کہا "لاؤ قرآن"

اور قرآن لیکر میں نے پھر وہی قسم دہرائی "ایک بچہ تمہارا نہیں ہے۔ کون سا بچہ! تم نہیں معلوم کر سکتے!" ہاتھ سے قرآن لیکر رکھد یا۔ اور چپ چاپ بُت کی طرح کھڑے رہے۔ ایک سناٹے کا عالم۔ چہرہ خاموش، کوئی جنبش نہ حرکت، میں غور سے دیکھتی ہی تھی کہ میرے پاس آ گئے۔ بالکل قریب۔ جیسے شیر جھپٹتا ہے۔ میری چھاتی پر چڑھکر ایک دم سے . . . . . خدا کی پناہ! ایک تیز اُسترے سے میری ناک کاٹ لی۔ میں ایک چیخ کے ساتھ پچھاڑ کھا کر گری ہوں اور وہ غائب۔ اس کے بعد کیا ہوا؟ اندازہ لگا لیجئے۔

گھر میں کوئی نوکرنی نہیں تھی۔ کھانا پکا کر چلی جاتی تھی۔ بچے اُٹھ بیٹھے۔ شور د شغب۔ قیامت کا شور۔ میری حالت معلوم۔ خدایا یہ کیا غضب ہوگیا! خسر صاحب کو لوگوں نے تار دیا۔

خُسر صاحب دوسرے دن شام کو آئے اور اپنے ساتھ لے گئے۔ میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ یا میرے اللہ! میں تو مُنہ دکھانے کی نہ رہی۔ ہسپتال میں پڑی تھی۔ گارڈ صاحب کی بیوی پر کیسی گذری خبر نہیں۔ غالباً وہ بچ گئیں۔

مرزا صاحب پولیس میں پکڑے گئے۔ ضمانت پر چھوڑ دیئے گئے۔ اور مقدمہ شروع ہوا۔ میں گھبرا کر ہسپتال سے اپنے گھر چلی گئی۔ اماں جان سے کہدیا کہ خواہ مخواہ کا میرے اوپر شُبہ کیا۔ اس سے زائد کچھ نہ بتایا۔

گھر آئے ہفتہ بھر ہوا ہوگا کہ عجب خبر سُنی۔ گارڈ صاحب نے چلتی ریل سے کود کر خودکشی کی کوشش کی۔ مگر یہاں سے دُور۔ اپنے حلقے کے انتہائی سرے پہ وہیں کے ضلع کے ہسپتال میں زیرِ علاج تھے۔ حالت سخت خطرناک تھی۔

معاملے نے بہت طول کھینچا۔ مگر بھانڈا پھوٹ گیا۔ ڈرائیور صاحب اور مرزا صاحب جو ملے تو بات معلوم ہوگئی۔ ڈرائیور صاحب کی بیوی نے موپساں کا افسانہ ہی جو دکھا دیا۔

مگر اب تو دونوں مقدمہ میں پھنسے تھے۔ اُدھر وہ خودکشی کے جرم میں اور اِدھر یہ ناک کاٹنے کے جرم میں۔ مگر بات جو چھوٹی ہے تو عام ہوگئی۔ میں مفت میں نکٹی ہوگئی۔

پولیس افسروں اور حاکموں تک کو معاملہ کی خبر ہوئی۔ اور ریلوے کے تمام بڑے افسروں کو خبر ہوگئی۔ سب کی جان کو مصیبت ہوگئی۔ میں نے یوں صبر کیا کہ بلا سے ناک گئی آفت سے جان تو چھوٹی۔ میکے میں دس دن رہنا نصیب نہیں ہوتا تھا۔ اب بقیہ عمر تو چین سے گذریگی۔ بچے میرے پاس صرف دو رہ گئے۔ باقی دادا کے پاس چلے گئے۔

کوئی ڈیڑھ مہینہ گذرا ہوگا۔ چلے آرہے ہیں حضرت۔ خدایا خیر۔ دیکھو کیا جھگڑا ہو۔ ہم دونوں تنہا ایک کمرے میں ملے۔ ناک پہ دوپٹے کا آنچل کسا ہوا۔ تھوڑی دیر چپ بیٹھے رہے۔ دیکھتے رہے۔ پھر میرے گلے میں ہاتھ ڈال دیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ خنخناتے ہوئے میں نے غصہ کا اظہار کیا۔

اڑا اڑا دھم۔ خیالی محل دھڑام سے گرا۔ ناک غائب۔ دوسرے دن اپنے
ہیڈ کوارٹر پر روانہ ہو گئے۔

بہت جلد معلوم ہوگیا کہ ناک متعفن ہو گئی۔ ہر وقت مرہم پٹی کسا رہتا۔ تجویز
یہ ہوئی کہ ناک بنے۔

"بخشئے۔" میں نے گھبرا کر کہا۔

"تمہاری آواز خوفناک ہے اور چہرہ بھیانک۔ ..... ڈراؤنا اور گھناؤنا۔
...... دیکھے سے جھرجھری آتی ہے۔"

"یا میرے اللہ تیرا لاکھ لاکھ شکر۔" میں نے ہاتھ اٹھا کر دعا مانگتے
ہوئے سجدہ کیا۔

کوئی ڈیڑھ مہینہ بعد۔ ایک ربڑ کی ناک بنوائی گئی۔ جو مرمت شدہ ناک پہ
چڑھائی جاتی اور عینک سے جگہ چھپی رہتی۔ تاکید یہ کہ اس کو لگائے رکھو۔ ہم گھر پہ
ہوں تو ضرور لگی رہے۔

ایک دن کا ذکر ہے میں بیٹھی سی رہی تھی کہ آئے۔

"ناک کہاں ہے؟"

"چولہے میں گئیں ناک" میں جل کر ٹھنٹھنائی۔ "معاف کیجئے" اور
میں سیتی رہی۔

حضرت ناک ڈھونڈ لائے۔

"لاکھ دفعہ کہدیا کہ میں آؤں تو لگی ملے "۔

"خن خن خن ..... خوں "۔ میں نے گھنا کر دیکھا

ناک لگائی گئی۔ اور میں نے خنخنا کر کہا۔ "مجھے کام کرنے دیجئے.....

بس....."

یں نے تیور بدلے۔ آنکھیں لال پیلی کیں۔ ..... اور پھر جل کے ناک نوچ

کے وہ پھینکی ..... اور ایسے بولی جیسے جھنی شیشے میں آ تا سی جائے۔ مگر ناک پھر

اُٹھا کر چسپاں کر دی گئی.....

ڈاکٹرنی نے کہا "آپ کو احتیاط کی ضرورت ہے۔ دو بچے معلوم ہوتے

ہیں۔ آپ کے ہاں ہوتے ہیں نا....."

اِدھر ڈاکٹرنی گئی ہے اور اُدھر میں نے اس اُجڑی ناک کو لیکر بٹے سے

چکنا چور کر دیا کہ آپ تشریف لاتے ہیں۔

"ارے یہ کیا؟ غضب کر دیا....."

خوب غل شور مچایا۔ بے حد خفا ہوئے۔ ہوا کرو۔ میری بلا سے

کچھ تو امن رہے گا۔

کھانا کھانے کے بعد جو آرام سے لیٹے ہیں کہ میں بھی آگئی۔ اخبار پڑھکر

سناتے رہے۔

گلے میں ہاتھ ڈال کر محبت سے سر سینے پر رکھ دیا۔ آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں۔ جل کر میں نے ناک پر سے ردپٹہ ہٹا کر اپنا قابل نفرت گھناؤنا اور بھیانک چہرہ کھولا کہ یہی سزا ہے کہ......

تڑاق......

اور میں نے اپنی نکٹی ناک کو ہاتھوں سے پیٹ لیا۔

حصّہ دوم

نسوانی فطرت کی لطیف کیفیتیں

(۱) عصمت چغتائی ۔ "لحاف" صفحہ ۷۱

عصمت صاحبہ کی ہمت افزائی کرتے ہوئے مسٹر صلاح الدین احمد فرماتے ہیں "یہ ہمارے ادب کی خوش قسمتی ہے کہ اسے صنف نازک میں سے ایک ایسی لکھنے والی میسر آئی جس نے ہمیں نسوانی فطرت کی ان نازک اور لطیف ترین کیفیتوں سے آشنا ہونے میں مدد دی۔ جن تک کسی تیز سے تیز مرد صاحب قلم کی رسائی محال نظر آتی ہے۔ . . ." آپ کا افسانہ "لحاف" ملاحظہ فرمائیے اور غور کیجئے کہ نسوانی فطرت کی نازک اور لطیف کیفیتیں کس شان سے واضح کی گئی ہیں۔ کیا اب بھی آپ کو اپنے ادب کی خوش قسمتی پر شبہ ہے؟

(۲) خواجہ محمد شفیع ۔ "ناکام" صفحہ ۸۹

نسوانی فطرت کی لطیف کیفیتیں "ناکام" میں بھی ملاحظہ فرمائیے۔ اس افسانہ کا انتخاب کرنے میں یہ چیز مد نظر تھی کہ گو خواجہ صاحب نے ایک بازاری عورت کی فطرت کی کیفیت بیان کی ہے لیکن تہذیب کی حدود میں رکھکر اور کس خوبی سے۔

(۳) ممتاز مفتی ۔ "آپا" صفحہ ۱۰۲

مفتی صاحب نے ہندوستانی معاشرت کی ایک دلکش تصویر کھینچی ہے۔ نسوانی فطرت کی لطیف کیفیتوں پر نہایت اچھی روشنی ڈالی ہے۔ ہندوستانی عورتوں کا وقار ان کی شرم و حیا سے ہے۔ ایسے افسانے ادب کی خدمت کرتے ہوئے پڑھنے والوں کے دل و دماغ پر ایک اچھا اثر چھوڑتے ہیں۔

لحاف

نہ معلوم یہ ... ہوا!
... ہے ...

"...... اور اب یہ حال ہے کہ عصمت کا نام آتے ہی مرد افسانہ نگاروں کو دورے پڑنے لگتے ہیں۔ شرمندہ ہو رہے ہیں۔ آپ ہی آپ خفیف ہوتے جا رہے ہیں....."

(کرشن چندر)

"..... فرق صرف دیکھنے کا ہے اور بات صرف کہہ دینے میں ہے۔ عصمت وہ کچھ دیکھ لیتی ہیں، شاید اپنے عورت ہونے کے باعث، جو کہ ایک اوسط درجہ کا فن کار نہیں دیکھتا۔ اور وہ کچھ کہہ دیتی ہیں، اور یہ اپنے عورت ہونے کے باوجود، جو ایک اعلےٰ درجہ کا مرد افسانہ نگار نہیں کہتا اور شاید نہیں کہہ سکتا۔ غالباً اس لئے کہ اسے اپنے مشاہدے پر یقین نہیں۔ شاید اس لئے کہ اس نے بعض سچائیوں کو ایسے قریب سے محسوس نہیں کیا کہ ان کا اظہار اپنے خلوص کی طاقت سے پڑھنے والوں کے دل و دماغ پہ چھا جائے۔ یہ ہمارے ادب کی خوش قسمتی ہے کہ اُسے صنفِ نازک میں سے ایک ایسی لکھنے والی میسّر آئی جس نے نہ صرف اس روائتی بناوٹ۔ تکلّف اور خوف کو یکسر دُور کر دیا۔ جس نے اس طبقہ کی رُوح کو دبا رکھا تھا۔ بلکہ اپنی ژرف نگاہی اور حق پرستی سے ہمیں نسوانی فطرت کی اُن نازک اور لطیف ترین کیفیتوں سے آشنا ہونے میں مدد دی جن تک کسی تیز سے تیز مرد صاحبِ قلم کی رسائی محال نظر آتی ہے....."

(صلاح الدین احمد)

جب میں جاڑوں میں لحاف اوڑھتی ہوں تو پاس کی دیوار پر اسکی پرچھائیں ہاتھی کی طرح جھومتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ اور ایک دم سے میرا دماغ بیتی ہوئی دُنیا کے پردوں میں دوڑنے بھاگنے لگتا ہے۔ نہ جانے کیا کچھ یاد آنے لگتا ہے۔

معاف کیجئے گا۔ میں آپ کو خود اپنے لحاف کا رومان انگیز ذکر نہیں بتانے جا رہی ہوں۔ نہ لحاف سے کسی قسم کا رومان جوڑا ہی جاسکتا ہے۔ میرے خیال میں کمبل کم آرام دہ سہی مگر اس کی پرچھائیں اتنی بھیانک نہیں ہوتی جتنی ـــــــ جب لحاف کی پرچھائیں دیوار پر ڈگمگا رہی ہو۔ یہ جب کا ذکر ہے جب میں چھوٹی سی تھی۔ اور دن بھر بھائیوں اور اُن کے دوستوں کے ساتھ مار کُٹائی میں گذار دیا کرتی تھی۔ کبھی کبھی مجھے خیال آتا ہے کہ میں کم بخت اتنی لڑاکا کیوں تھی۔ اس عمر میں جبکہ میری اور بہنیں عاشق جمع کر رہی تھیں۔ میں اپنے پرائے ہر لڑکے اور لڑکی سے جُوتم پیزار میں مشغول تھی۔

یہی وجہ تھی کہ اماں جب آگرہ جانے لگیں تو ہفتہ بھر کے لئے مجھے اپنی ایک مُنہ بولی بہن کے پاس چھوڑ گئیں۔ اُن کے یہاں اماں خوب جانتی تھیں کہ چوہے کا بچہ بھی نہیں اور میں کسی سے بھی لڑ بھڑ نہ سکونگی۔ سزا تو خوب تھی میری! ہاں تو اماں مجھے بیگم جان کے پاس چھوڑ گئیں۔ وہی بیگم جان جن کا لحاف اب تک میرے ذہن میں گرم لوہے کے داغ کی طرح محفوظ ہے۔ یہ وہ بیگم جان تھیں جن کے غریب ماں باپ نے نواب صاحب کو اس لئے داماد بنا دیا کہ گو وہ "پکی" عمر کے تھے، مگر تھے نہایت نیک نیت

کبھی کوئی رنڈی یا بازاری عورت اُن کے یہاں نظر نہ آئی۔ خود حاجی تھے اور بہتوں کو حج کرا چکے تھے۔

مگر انہیں ایک نہایت عجیب وغریب شوق تھا۔ لوگوں کو کبوتر پالنے کا جنون ہوتا ہے۔ بٹیریں لڑاتے ہیں۔ مرغ بازی کرتے ہیں۔ اس قسم کے واہیات کھیلوں سے نواب صاحب کو نفرت تھی۔ اُن کے یہاں تو بس طالب علم رہتے تھے۔ نوجوان گورے گورے، پتلی کمروں کے لڑکے۔ جن کا خرچ وہ خود برداشت کرتے تھے۔

مگر بیگم جان سے شادی کرکے تو وہ انہیں کُل ساز وسامان کے ساتھ ہی گھر میں رکھکر بھول گئے۔ اور وہ بچاری دُبلی پتلی نازک سی بیگم تنہائی کے غم میں گھلنے لگیں۔

نہ جانے اُن کی زندگی کہاں سے شروع ہوتی ہے۔ وہاں سے جب وہ پیدا ہونے کی غلطی کر چکی تھیں۔ یا وہاں سے جب وہ ایک نواب کی بیگم بن کر آئیں۔ اور چھپرکھٹ پر زندگی گذارنے لگیں۔ یا جب سے نواب صاحب کے یہاں لڑکوں کا زور بندھا۔ اُن کے لئے مرغن حلوے اور لذیذ کھانے جانے لگے۔ اور بیگم جان دیوان خانے کی درازوں میں سے اُن لچکتی کمروں والے لڑکوں کی چست پنڈلیاں اور معطر باریک شبنم کے کرتے دیکھ دیکھکر انگاروں پر لوٹنے لگیں۔

یا جب سے جب وہ منتوں مرادوں سے ہار گئیں۔ چلّے بندھے اور ٹوٹکے اور راتوں کی وظیفہ خوانی بھی چیت ہوگئی۔ کہیں پتھر میں جونک لگتی ہے؟ نواب صاحب اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہ ہوئے۔ پھر بیگم جان کا دل ٹوٹ گیا۔ اور وہ

علم کی طرف متوجہ ہوئیں۔ لیکن یہاں بھی انہیں کچھ نہ ملا۔ عشقیہ ناول اور جذباتی اشعار پڑھکر اور بھی پستی چھا گئی۔ رات کی نیند بھی ہاتھ سے گئی۔ اور بیگم جان جی جان چھوڑ کر بالکل ہی یاس و حسرت کی پوٹ بن گئیں۔

چولھے میں ڈالا تھا ایسا کپڑا لتا۔ کپڑا پہنا جاتا ہے کسی پر رعب گانٹھنے کے لئے۔ اب نہ تو نواب صاحب کو فرصت کہ شبنمی کرتوں کو چھوڑ کر ذرا اس طرف توجہ کریں اور نہ وہ انہیں آنے جانے دیتے۔ جب سے بیگم جان بیاہ کر آئی تھیں، رشتہ دار آکر مہینوں رہتے اور چلے جاتے۔ مگر وہ بچاری قید کی قید رہتیں۔

ان رشتہ داروں کو دیکھکر اور بھی ان کا خون جلتا تھا کہ سب کے سب مفت میں مال اڑانے، عمدہ گھی نگلنے، جاڑے کا ساز و سامان بنوانے آن مرتے ہیں اور باوجود نئی روئی کے لحاف کے پڑی سردی میں اکڑا کرتیں۔ ہر کروٹ پر لحاف نئی نئی صورتیں بنا کر دیوار پر سایہ ڈالتا۔ مگر کوئی بھی سایہ ایسا نہ تھا جو انہیں زندہ رکھنے کیلئے کافی ہو۔ مگر کیوں جئے پھر کوئی؟ ــــــ زندگی! بیگم جان کی زندگی جو تھی۔ جینا بدا تھا نصیبوں میں۔ وہ پھر جینے لگیں اور خوب جئیں۔

ربو نے انہیں نیچے گرتے گرتے سنبھال لیا۔ چٹ پٹ دیکھتے دیکھتے ان کا سوکھا جسم بھرنا شروع ہوا۔ گال چمک اٹھے اور حسن پھوٹ نکلا۔ ایک عجیب و غریب تیل کی مالش سے بیگم جان میں زندگی کی جھلک آگئی۔ معاف کیجئے گا اس

تیل کا نسخہ آپ کو بہترین سے بہترین رسالہ میں بھی نہ ملے گا۔

جب میں نے بیگم جان کو دیکھا تو وہ چالیس بیالیس کی ہونگی۔ اُفوہ کس شان سے وہ مسند پہ نیم دراز تھیں۔ اور ربّو ان کی پیٹھ سے لگی بیٹھی کمر دبا رہی تھی۔ ایک اُودے رنگ کا دوشالہ اُن کے پیروں پر پڑا تھا۔ اور وہ مہارانی کی طرح شان دار معلوم ہو رہی تھیں۔ مجھے اُن کی شکل بے انتہا پسند تھی۔ میرا جی چاہتا تھا گھنٹوں بالکل پاس سے اُن کی صورت دیکھا کروں۔ ان کی رنگت بالکل سفید تھی۔ نام کو سُرخی کا ذکر نہیں۔ اور بال سیاہ اور تیل میں ڈوبے رہتے تھے۔ میں نے آج تک ان کی مانگ ہی بگڑی نہ دیکھی۔ کیا مجال جو ایک بال اِدھر سے اُدھر ہو جائے۔ ان کی آنکھیں کالی تھیں۔ اور ابرو پہ کے زائد بال علیحدہ کر دینے سے کمانیں سی کھنچی ہوئی تھیں۔ آنکھیں ذرا تنی ہوئی رہتی تھیں۔ بھاری بھوے ہوئے پپوٹے، موٹی موٹی پلکیں۔ سب سے زیادہ جو اُن کے چہرے پر حیرت انگیز، جاذب نظر چیز تھی وہ اُن کے ہونٹ تھے۔ عموماً وہ سرخی سے رنگے رہتے تھے۔ اُوپر کے ہونٹ پہ ہلکی ہلکی مونچھیں سی تھیں۔ اور کنپٹیوں پر لمبے لمبے بال۔ کبھی کبھی اُن کا چہرہ دیکھتے دیکھتے عجیب سا لگنے لگتا۔ کم عمر لڑکوں جیسا۔

اُن کے جسم کی جلد بھی سفید اور چکنی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کسی نے کس کر ٹانکے لگا دیئے ہوں۔ عموماً وہ اپنی پنڈلیاں کھجانے کے لئے کھولتیں۔ تو میں چپکے

چیکے اُن کی چمک دیکھا کرتی۔ اُن کا قد بہت لمبا تھا۔ اور پھر گوشت ہونے کی وجہ سے وہ بہت ہی لمبی چوڑی معلوم ہوتی تھیں۔ لیکن بہت متناسب اور ڈھلا ہوا جسم تھا۔ بڑے بڑے چکنے اور سفید ہاتھ۔ اور سڈول کمر، تو ربّو ان کی پیٹھ کھجایا کرتی تھی۔ یعنی گھنٹوں اُن کی پیٹھ کھجایا کرتی۔ پیٹھ کھجوانا بھی زندگی کی ضروریات میں سے تھا۔ بلکہ شاید ضروریاتِ زندگی سے بھی زیادہ۔

ربّو کو گھر کا اور کوئی کام نہ تھا۔ بس وہ سارے وقت ان کے چھپر کھٹ پہ چڑھی کبھی پیر، کبھی سر اور کبھی جسم کے اور دوسرے حصّہ کو دبایا کرتی تھی۔ کبھی تو میرا دل بول اُٹھتا تھا، جب دیکھو ربّو کچھ نہ کچھ دبا رہی ہیں۔ یا مالش کر رہی ہے۔ کوئی دوسرا ہوتا تو نہ جانے کیا ہوتا۔ میں اپنا کہتی ہوں کوئی اتنا چھوئے بھی تو میرا جسم تو سڑ گل کے ختم ہو جائے۔

اور پھر یہ روز روز کی مالش کافی نہیں تھی۔ جس روز بیگم جان نہاتیں۔ یااللہ بس دو گھنٹہ پہلے سے تیل اور خوشبودار تیلوں کی مالش شروع ہو جاتی۔ اور اتنی ہوتی کہ میرا تو تخیل سے ہی دل لوٹ جاتا۔ کمرہ کے دروازے بند کر کے انگیٹھیاں سلگتیں اور پھر چلتا مالش کا دور۔ عموماً صرف ربّو ہی رہتیں۔ باقی کی نوکرانیاں منہ بناتی بڑبڑاتی دروازے پر سے ہی ضروریات کی چیزیں دیتی جاتیں۔

بات یہ تھی کہ بیگم جان کو کھجلی کا مرض تھا۔ بچاری کو ایسی کھجلی ہوتی تھی کہ ہزاروں تیل اور اُبٹنے ملے جاتے تھے مگر کھجلی تھی کہ قائم۔ ڈاکٹر، حکیم کہتے "کچھ بھی نہیں جسم

صاف چٹ پڑا ہے۔ ہاں کوئی جلد کے اندر بیماری ہو تو خیر۔" نہیں بھئی یہ ڈاکٹر
تو موئے ہیں پاگل ——— کوئی آپ کے دشمنوں کو مرض ہے؟ اللہ رکھے
خون میں گرمی ہے۔" ربو مسکرا کر کہتی اور مہین مہین نظروں سے بیگم جان کو
گھورتی اوہ یہ ربو ——— جتنی بیگم جان گوری تھیں اتنی ہی یہ کالی جتنی بیگم جان
سفید تھیں اتنی ہی یہ سرخ، بس جیسے تپایا ہوا لوہا۔ ہلکے ہلکے چیچک کے داغ۔
گٹھا ہوا ٹھوس جسم۔ پھرتیلے چھوٹے چھوٹے ہاتھ۔ کسی ہوئی چھوٹی سی توند، بڑے
بڑے پھولے ہوئے ہونٹ۔ جو ہمیشہ نمی میں ڈوبے رہتے اور جسم میں سے عجیب
گھبرانے والی بو کے شرارے نکلتے رہتے تھے۔ اور یہ ننھے ننھے پھولے ہوئے ہاتھ
کس قدر پھرتیلے تھے۔ ابھی کمر پر ہے تو وہ لیجئے پھسل کر گئے کولھوں پر، وہاں
سے رپٹے رانوں پر۔ اور پھر دوڑ ٹخنوں کی طرف۔ میں تو جب کبھی بیگم جان کے پاس
بیٹھتی یہی دیکھتی کہ اب اس کے ہاتھ کہاں ہیں اور کیا کر رہے ہیں؟

گرمی جاڑے بیگم جان حیدرآبادی جالی کارگے کے کرتے پہنتیں۔ گہرے رنگ
کے پاجامے اور سفید جھاگ سے کرتے اور پنکھا بھی چلتا ہو۔ پھر بھی وہ ہلکی دلائی
ضرور جسم پر ڈھکے رہتی تھیں۔ انہیں جاڑا بہت پسند تھا۔ جاڑے میں مجھے بھی ان کے
یہاں اچھا معلوم ہوتا۔ وہ ہلتی جلتی بہت کم تھیں۔ قالین پر لیٹی ہیں۔ پیٹھ کھج رہی ہے
خشک میوے چبا رہی ہیں اور بس۔ ربو سے دوسری ساری نوکرانیاں خار کھاتی
ہیں۔ چڑیل بیگم جان کے ساتھ کھاتی، ساتھ اٹھتی بیٹھتی اور ماشاءاللہ ساتھ ہی

سوتی تھی۔ ربّو اور بیگم جان عام جلسوں اور مجمعوں کی دلچسپ گفتگو کا موضوع تھیں
جہاں ان دونوں کا ذکر آیا اور قہقہے اُٹھے۔ لوگ نہ جانے کیا کیا چٹکلے غریب پر اُڑاتے
مگر وہ دنیا میں کسی سے ملتی ہی نہ تھیں۔ وہاں تو بس وہ تھیں اور اُن کی کھجلی۔

میں نے کہا نا کہ اُس وقت میں کافی چھوٹی تھی اور بیگم جان پر فِدا۔ وہ بھی
مجھے بہت ہی پیار کرتی تھیں۔ اتفاق سے اماں آگرے گئیں۔ انہیں معلوم تھا کہ اکیلے
گھر میں بھائیوں سے مار کٹائی ہوگی۔ ماری ماری پھرونگی۔ اِس لئے وہ ہفتہ بھر کیلئے
بیگم جان کے پاس چھوڑ گئیں۔ میں بھی خوش اور بیگم جان بھی خوش۔ آخر کو اماں کی
بھابی بنی ہوئی تھیں۔

سوال یہ اٹھا کہ میں سوؤں کہاں؟ قدرتی طور پہ بیگم جان کے کمرے میں لہٰذا
میرے لئے بھی اُن کے چھپر کھٹ سے لگا کر چھوٹی سی پلنگڑی ڈال دی گئی۔ دس گیارہ
بجے تک تو باتیں کرتے رہے۔ اور میں اور بیگم جان چانس کھیلتے رہے اور پھر میں
سونے کے لئے اپنے پلنگ پر چلی گئی۔ اور جب میں سوئی تو ربّو ویسی ہی بیٹھی اُن کی پیٹھ
کھجا رہی تھی۔ "بھنگن کہیں کی ——" میں نے سوچا۔ رات کو میری ایک دم
سے آنکھ کُھلی تو مجھے عجیب طرح کا ڈر لگنے لگا۔ کمرے میں گھپ اندھیرا اور اس اندھیرے
میں بیگم جان کا لحاف ایسے ہل رہا تھا جیسے اُس میں ہاتھی بند ہو۔

"بیگم جان —— !" میں نے ڈری ہوئی آواز نکالی۔ ہاتھی ہلنا بند ہوگیا
لحاف نیچے دب گیا۔

"کیا ہے ــــ ؟ سو رہو ــــ" بیگم جان نے کہیں سے آواز دی۔

"ڈر لگ رہا ہے ــــ" میں نے چوہے کی سی آواز سے کہا۔

"سو جاؤ ــــ ڈر کی کیا بات ہے ــــ آیۃ الکرسی پڑھو۔"

"اچھا ــــ" میں نے جلدی جلدی آیۃ الکرسی پڑھی۔ مگر یعلم ما بین

ــــ پر ہر دفعہ آکر اٹک گئی۔ حالانکہ مجھے اس وقت پوری آیۃ یاد ہے۔

"تمہارے پاس آ جاؤں بیگم جان ــــ"

"نہیں ــــ بیٹی ــــ سو رہو ــــ" ذرا سختی سے کہا۔

اور پھر دو آدمیوں کے کھسر پھسر کرنے کی آواز سنائی دینے لگی ــــ

ہائے رے یہ دوسرا کون ؟ میں اور بھی ڈری۔

"بیگم جان ــــ چور وور تو نہیں ــــ"

"سو جاؤ بیٹا ــــ کیسا چور ــــ" ربو کی آواز آئی۔ میں

جلدی سے لحاف میں منہ ڈال کر سو گئی۔

صبح میرے ذہن میں رات کے خوفناک نظارے کا خیال بھی نہ رہا۔ میں ہمیشہ کی

وہمی ہوں۔ رات کو ڈرنا۔ اٹھ اٹھ کر بھاگنا اور بڑبڑانا تو بچپن میں روز ہی ہوتا تھا۔

سب تو کہتے تھے مجھ پر بھوتوں کا سایہ ہو گیا ہے۔ لہذا مجھے خیال بھی نہ رہا۔ صبح کو

لحاف بالکل معصوم نظر آ رہا تھا۔ مگر دوسری رات میری آنکھ کھلی تو ربو اور بیگم جان

میں کچھ جھگڑا بڑی خاموشی سے چھپر کھٹ پر ہی طے ہو رہا تھا اور میری خاک سمجھ

میں نہ آیا تھا۔ کیا اور کیا فیصلہ ہوا۔ ربو ہچکیاں لے کر روئی۔ پھر بلی کی طرح سپڑ سپڑ رکابی چاٹنے جیسی آوازیں آنے لگیں ــــــ اودھ میں تو گھبرا گئی۔

آج ربو اپنے بیٹے سے ملنے گئی ہوئی تھی۔ وہ بڑا جھگڑالو تھا۔ بہت کچھ بیگم جان نے کیا۔ اُسے دکان کرائی ــــــ گاؤں میں لگایا۔ مگر وہ کسی طرح مانتا ہی نہیں تھا۔ نواب صاحب کے یہاں کچھ دن رہا۔ خوب جوڑے باگے بھی بنے پر نہ جانے کیوں ایسا بھاگا کہ ربو سے بھی ملنے نہ آتا ــــــ لہٰذا ربو ہی اپنے کسی رشتہ دار کے یہاں اس سے ملنے گئی تھی۔ بیگم جان نہ جانے دیتی تھیں۔ مگر ربو بھی مجبور ہو گئی۔

سارا دن بیگم جان پریشان رہیں۔ اُن کا جوڑ جوڑ ٹوٹتا رہا۔ کسی کا چھونا بھی اُنھیں نہ بھاتا تھا۔ اُنہوں نے کھانا بھی نہ کھایا۔ اور سارا دن اُداس پڑی رہی۔

"میں کھجا دوں بیگم جان ــــــ" میں نے بڑے شوق سے تاش کے پتے بانٹتے ہوئے کہا۔ بیگم جان مجھے غور سے دیکھنے لگیں۔

"میں کھجا دوں ــــــ سچ کہتی ہوں ــــــ" میں نے تاش رکھ دیئے۔

میں تھوڑی دیر تک کھجاتی رہی اور بیگم جان چپکی لیٹی رہیں۔ دوسرے دن ربو کو آنا تھا ــــــ مگر وہ آج بھی غائب تھی۔ بیگم جان کا مزاج چڑچڑا ہوتا گیا ــــــ چائے پی پی کر اُنہوں نے سر میں درد کر لیا۔

میں پھر کھجانے لگی اُن کی پیٹھ ــــــ چکنی میز کی تختی جیسی پیٹھ ــــــ میں ہوے ہوے کھجاتی رہی۔ اُن کا کام کر کے کیسی خوش ہوتی تھی۔

"ذرا زور سے کھجاؤ ــــــ بند کھول دو ــــــ" بیگم جان بولیں۔ "اِدھر ــــــ اے ہے ذرا شانے سے نیچے ــــــ ہاں ــــــ واہ بھئی واہ ــــــ ہا ــــــ ہا ــــــ" وہ سرور میں ٹھنڈی سانسیں لیکر اطمینان ظاہر کرنے لگیں۔

"اور اِدھر ــــــ" حالانکہ بیگم جان کا ہاتھ خوب جا سکتا تھا۔ مگر وہ مجھ سے ہی کھجوا رہی تھیں اور مجھے اُلٹا فخر ہو رہا تھا۔ "یہاں ــــــ اوئی ــــــ تم تو گدگدی کرتی ہو ــــــ واہ ــــــ" وہ ہنسیں۔ میں باتیں بھی کر رہی تھی اور کھجا بھی رہی تھی۔

"تمہیں کل بازار بھیجوں گی ــــــ کیا لوگی؟ ــــــ وہی سوتی جاگتی گڑیا"

"نہیں بیگم جان ــــــ میں تو گڑیا نہیں لیتی ــــــ کیا بچّے ہوں اب میں"

"بچّہ نہیں تو کیا بوڑھی ہو گئی ــــــ" وہ ہنسیں ــــــ "گڑیا نہیں تو بوا لینا ــــــ کپڑے پہنانا خود ـ میں دونگی تمہیں بہت سے کپڑے ــــــ سُنا ــــــ" اُنہوں نے کروٹ لی۔

"اچھا۔" میں نے جواب دیا۔

"اِدھر ــــــ" اُنہوں نے میرا ہاتھ پکڑ کر جہاں کھجلی ہو رہی تھی رکھدیا۔ جہاں

انہیں کھجلی معلوم ہوتی وہاں میرا ہاتھ رکھ دیتیں اور میں بے خیالی میں ہوے کے دھیان میں ڈوبی ہوئی مشین کی طرح کھجاتی رہی اور وہ متواتر باتیں کرتی رہیں۔

"سنو تو ـــــ تمہاری فراکیں کم ہوگئی ہیں۔ کل درزی کو دیدوں گی کہ نئی سی لائے۔ تمہاری اماں کپڑا دے گئی ہیں۔"

"وہ لال کپڑے کی نہیں بنواؤں گی ـــــ چماروں جیسا ہے ـــــ"

میں بکواس کررہی تھی۔ اور ہاتھ نہ جانے کہاں سے کہاں پہنچا۔ باتوں باتوں میں مجھے معلوم بھی نہ ہوا۔ بیگم جان تو چت لیٹی تھیں ـــــ ارے ـــــ میں نے جلدی سے ہاتھ کھینچ لیا۔

"اوئی لڑکی ـــــ دیکھ کر نہیں کھجاتی ـــــ میری پسلیاں نوچے ڈالتی ہے ـــــ" بیگم جان شرارت سے مسکرائیں اور میں جھینپ گئی۔

"اِدھر آکر میرے پاس لیٹ جا ـــــ" انہوں نے مجھے بازو پر سر رکھ کر لٹا لیا۔

"اے ہے کتنی سوکھ رہی ہے ـــــ پسلیاں نکل رہی ہیں۔" انہوں نے میری پسلیاں گننا شروع کیں۔

"اوں ـــــ" میں منمنائی

"اوئی ـــــ تو کیا میں کھا جاؤں گی ـــــ کیسا تنگ سوئیٹر بنا ہے گرم بنیان بھی نہیں پہنا تم نے ـــــ" میں کلبلانے لگی

"کتنی پسلیاں ہوتی ہیں ——— ؟" انہوں نے بات بدلی۔

"ایک طرف نو اور ایک طرف دس ۔" میں نے اسکول کی یاد کی ہوئی ہائی جن کی مدد لی۔ وہ بھی اوٹ پٹانگ۔

"ہٹاؤ تو ہاتھ ——— ہاں، ایک ——— دو ——— تین ———"

میرا دل چاہا کسی طرح بھاگوں ——— اور انہوں نے زور سے بھینچا۔

"اوں ———" میں مچل گئی۔ بیگم جان زور زور سے ہنسنے لگیں۔

اب بھی جب کبھی میں اُن کا اُس وقت کا چہرہ یاد کرتی ہوں تو دل گھبرانے لگتا ہے ان کی آنکھوں کے پپوٹے اور وزنی ہو گئے تھے۔ اُوپر کے ہونٹ پر سیاہی گھری ہوئی تھی۔ باوجود سردی کے پسینے کی ننھی ننھی بوندیں ہونٹوں اور ناک پر چمک رہی تھیں اُن کے ہاتھ ٹھنڈے یخ تھے۔ مگر نرم نرم۔ جیسے ان پر کی کھال اُتر گئی ہو۔ انہوں نے شال اُتار دی تھی اور کارگے کے مہین کرتے میں سے اُن کا جسم آٹے کی لوئی کی طرح چمک رہا تھا۔ بھاری جڑاؤ سونے کے بٹن گریبان کے ایک طرف جھول رہے تھے۔ شام ہو گئی تھی اور کمرے میں اندھیرا گھٹ رہا تھا۔ مجھے ایک نامعلوم ڈر سے وحشت سی ہونے لگی۔ بیگم جان کی گہری گہری آنکھیں۔ میں رونے لگی دل میں۔ وہ مجھے ایک مٹی کے کھلونے کی طرح بھینچ رہی تھیں۔ اُن کے گرم گرم جسم سے میرا دل ہولانے لگا۔ مگر اُن پر تو جیسے کوئی بھتنا سوار تھا۔ اور میرے دماغ کا یہ حال کہ چیخا جائے

اور نہ رو سکوں۔

تھوڑی دیر کے بعد وہ پست ہوکر نڈھال لیٹ گئیں۔ اُن کا چہرہ پھیکا اور بدرونق ہوگیا اور لمبی لمبی سانسیں لینے لگیں۔ میں سمجھی کہ اب مریں یہ اور وہاں سے اُٹھکر سرپٹ بھاگی باہر ——— !

شکر ہے رتو رات کو آگئی اور میں ڈری ہوئی جلدی سے لحاف اوڑھ سوگئی ——— مگر نیند کہاں۔ چُپ گھنٹوں پڑی رہی۔

اماں کسی طرح آ ہی نہیں چکی تھیں۔ بیگم جان سے مجھے ایسا ڈر لگتا تھا کہ میں سارا دن ماماؤں کے پاس بیٹھی رہی۔ مگر اُن کے کمرے میں قدم رکھتے دم نکلتا تھا۔ اور کہتی کس سے۔ اور کہتی ہی کیا۔ کہ بیگم جان سے ڈر لگتا ہے ؟ تو یہ بیگم جان جو میرے اوپر جان چھڑکتی تھیں۔

آج رتو میں اور بیگم جان میں پھر اَن بن ہوگئی ——— میری قسمت کی خرابی کہئے یا کچھ اور مجھے ان دونوں کی اَن بن سے ڈر لگا۔ کیونکہ فوراً ہی بیگم جان کو خیال آیا کہ میں باہر سردی میں گھوم رہی ہوں اور مردوں گی نمونیہ میں۔

"لڑکی کیا میرا سر منڈوائے گی۔ جو کچھ ہو ہوا گیا تو اور آفت آئے گی "

اُنہوں نے مجھے پاس بٹھالیا۔ وہ خود مُنہ ہاتھ سلفچی میں دھورہی تھیں۔ چائے تپائی پہ رکھی تھی۔

"چائے تو بناؤ —— ایک پیالی مجھے بھی دینا —— وہ تولیہ سے مُنہ خشک کر کے بولیں —— میں ذرا کپڑے بدل لوں۔

وہ کپڑے بدلتی رہیں اور میں چائے پیتی رہی۔ بیگم جان نائن سے پیٹھ ملواتے وقت اگر مجھے کسی کام سے بلاتیں تو میں گردن موڑے موڑے جاتی اور واپس بھاگ آتی۔ اب جو انہوں نے کپڑے بدلے تو میرا دل اُلٹنے لگا۔ مُنہ موڑے میں چائے پیتی رہی۔

"ہائے امّاں ——" میرے دل نے بیکسی سے پکارا ——"آخر ایسا میں بھائیوں سے کیا لڑتی ہوں۔ جو تم میری مُصیبت ——" امّاں کو ہمیشہ سے میرا لڑکوں کے ساتھ کھیلنا ناپسند ہے۔ بھلا کہو لڑکے کیا شیر چیتے ہیں۔ جو نگل جائیں گے، اُن کی لاڈلی کو۔ اور لڑکے بھی کون؟ خود بھائی اور دو چار سڑے سڑائے ذرا ذرا سے اُن کے دوست۔ مگر نہیں وہ تو عورت ذات کو سات تالوں میں رکھنے کی قائل، اور یہاں بیگم جان کی وہ دہشت، کہ دُنیا بھر کے غنڈوں سے نہیں۔ بس چلتا تو اس وقت سڑک پر بھاگ جاتی، پر وہاں نہ ٹکتی، مگر لاچار تھی۔ مجبوراً کلیجہ پہ پتھر رکھے بیٹھی رہی۔

کپڑے بدل سولہ سنگار ہوئے۔ اور گرم گرم خوشبوؤں کے عِطر نے اور بھی اُنہیں انگارہ بنا دیا۔ اور وہ چلیں مجھ پر لاڈ اُتارنے!

"گھر جاؤں گی ——" میں نے ان کی ہر رائے کے جواب میں کہا

اور رونے لگی۔

"میرے پاس تو آؤ میں ——— تمہیں بازار لیچلوں گی ——— سنو تو ———"

مگر میں کھلی کی طرح پھیل گئی ——— سارے کھلونے۔ مٹھائیاں ایک طرف اور گھر جانے کی رٹ ایک طرف۔

"وہاں بھیا ماریں گے ——— چڑیل ———" انہوں نے مجھے پیار سے تھپڑ لگایا۔

"بڑے ماریں بھیا ———" میں نے دل میں سوچا۔ اور روٹھی اکڑی بیٹھی رہی۔

"کچی امیاں کھٹی ہوتی ہیں بیگم جان ———" جلی کٹی ربو نے رائے دی اور پھر اس کے بعد بیگم جان کو دورہ پڑ گیا۔ سونے کا ہار جو وہ تھوڑی دیر پہلے مجھے پہنا رہی تھیں ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ مہین جالی کا دوپٹہ تار تار۔ اور وہ مانگ جو میں نے کبھی بگڑی نہ دیکھی تھی جھاڑ جھنکاڑ ہو گئی۔

" اوہ ——— اوہ اوہ اوہ ———" وہ جھٹکے لے لیکر چلانے لگیں۔

میں رپٹی باہر!

بڑے جتنوں سے بیگم جان کو ہوش آیا۔ جب میں سونے کے لئے کمرے میں دبے پیر جا کر جھانکی تو ربو ان کی کمر سے لگی جسم دبا رہی تھی۔

"جوتی اتار دو ـــــــ" اس نے ان کی پسلیاں کھجاتے ہوئے کہا۔ اور میں چوہیا کی طرح لحاف میں دبک گئی۔

سر سر پھٹ کچ ـــــــ بیگم جان کا لحاف اندھیرے میں پھر ہاتھی کی طرح جھوم رہا تھا۔ اللہ! "آں ـــــــ" میں نے مری ہوئی آواز نکالی۔ لحاف میں ہاتھی پھدکا اور بیٹھ گیا۔ میں بھی چپ ہو گئی۔ ہاتھی نے پھر لوٹ مچائی۔ میرا رُواں رُواں کانپا۔ آج میں نے دل میں ٹھان لیا کہ ضرور ہمت کر کے سرہانے کا لگا ہوا بلب جلا دوں۔ ہاتھی پھر پھڑپھڑا رہا تھا۔ اور جیسے اُکڑوں بیٹھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ چپڑ چپڑ کچھ کھانے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ جیسے کوئی مزے دار چٹنی چکھ رہا ہو۔ اب میں سمجھی! یہ بیگم جان نے آج کچھ نہیں کھایا۔ اور ربّو مُردی تو ہے سدا کی چٹو۔ ضرور یہ تر مال اُڑا رہی ہے۔ میں نے نتھنے پھیلا کر "سوں سوں" ہوا کو سونگھا۔ سوائے عطر صندل اور حنا کی گرم گرم خوشبو کے اور کچھ نہ محسوس ہوا۔

لحاف پھر اُمنڈنا شروع ہوا۔ میں نے بہتیرا چاہا کہ چپکی پڑی رہوں ـــــــ مگر اس لحاف نے تو ایسی عجیب عجیب شکلیں بنانی شروع کیں کہ میں لرز گئی۔ معلوم ہوتا تھا غوں غوں کر کے کوئی بڑا سا مینڈک پھول رہا ہے۔ اور اب اُچھل کر میرے اوپر آیا۔

"آ ــــ ن ــــ امّاں ــــ" میں ہمّت کر کے گنگنائی۔ مگر وہاں کچھ شنوائی نہ ہوئی اور لحاف میرے دماغ میں گھس کر پھولنا شروع ہوا۔ میں نے ڈرتے ڈرتے پلنگ کے دوسری طرف پیر اتارے اور ٹٹول کر بجلی کا بٹن دبا دیا۔ ہاتھی نے لحاف کے نیچے ایک قلابازی لگائی اور پچک گیا۔ قلابازی لگانے میں لحاف کا کونا فٹ بھر اٹھا ــــــ

اللہ! میں غڑاپ سے اپنے بچھونے میں!!

ناکام

خواجہ محمد شفیع دہلوی

خوب اصلا

برو ایں دام بر مرغ دگر نہ
کہ عنقا را بلند است آشیانہ

ہم سب دریا کنارے بیٹھے تھے۔ ایک لہر اُبھرتی۔ دوسری اسے دبا دیتی پھر خود بھی نیچا دیکھتی۔ موجیں ایک دوسری کو پامال کرتی اور پامال ہوتی چلی جا رہی تھیں۔ دریا نام تھا اس لا متناہی سلسلہ کا۔ بُلبلہ سر اُٹھاتا دبا دیا جاتا اپنی سطح سے اُبھرتا ٹھکرا دیا جاتا۔ آنکھ بند کر کے اُٹھتا۔ آنکھ کھلتے ہی اپنے آپ کو غرقِ آب پاتا۔ خیرہ سر سرشکستہ ہوتا۔ بادِ غرور اُبھارتی، حقیقت چشم کُشائی کرتی۔ ہوا ساتھ نہ دیتی۔ پانی کا پانی رہ جاتا۔

باتیں ہو رہی تھیں۔ کڑھائی چڑھی تھی۔ نوکر گرم گرم پکوان لا رہے تھے۔ ایک صاحب پٹنی سالن کی طرح کھا رہے تھے۔ میں بھی اُن کی اس مردانہ جرأت پر جھوٹی حیرت کا اظہار کر رہی تھی۔ اب انہوں نے پُوری پُوری مرچیں چبانی شروع کر دیں۔ جس طرح بھانمتی چیز غائب کر کے تماشائیوں کی طرف دیکھتا ہے یہ بھی ہر مرچ کھانے کے بعد ہماری جانب اُلّو کی طرح دیکھتے تھے۔ مجھ پر اپنی برداشت کا سکہ جما رہے تھے۔ اس بے وقوف میں اتنی برداشت نہ تھی کہ جذبۂ خود نمائی کو دباتا۔ مرچیں تو طوطا بھی کھا لیتا ہے۔

ایک اپنی پرخوری کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ رکابیوں پر رکابیاں صاف کرتے چلے جاتے، ساتھ ساتھ یہ بھی اعلان فرماتے تھے کہ چاہنے والی بیوی نے اچھی طرح پیٹ بھر کر بھیجا تھا اور کہہ دیا تھا کہ سب کے سامنے زیادہ نہ کھانا۔ نظر لگ جائیگی۔ اللہ تمہارے اکلوتے "ارنے بھینسے کو نظر بد سے بچائے۔ لیکن بہن دوزخ شکم بھرنے سے کام نہیں نبے گا۔ اگر ہوس مرد بھر سکو تو بھرو۔ جو کام نہ تمہارے بس کا ہے نہ میرے۔

ایک نے کہا کاظم صاحب نہیں آئے۔ دوسرے بولے وعدہ تو کیا تھا، پر آج کل انہیں فرصت کم ہے۔ دن بھر کام میں رندھے رہتے ہیں۔ کئی کتابیں شروع کر رکھی ہیں۔ پر صاحب لکھتا غضب کا ہے۔ اور حیرت تو یہ ہے کہ کیا طبیعت کی باگیں موڑی ہیں۔ خوش وقت رنگین انسان چوبیس گھنٹہ گلفرخوں میں رہنے والا اب ادھر کا رخ بھی نہیں کرتا۔ میز ہے اور وہ، جب جا کر دیکھو بیٹھا کام کر رہا ہے۔ اور سچ پوچھو تو مجھے اس کی صحت پر بھی اثر پڑتا معلوم ہوتا ہے۔ بھلا خیال کرو چار پانچ گھنٹے اکھاڑے میں ورزش کرنے والا انسان جو یک قلم اس طرف سے ہاتھ اٹھالے تو آپ سے آپ صحت خراب ہوگی۔ میں نے پوچھا کوئی ایڈیٹر ہیں؟ جواب ملا نہیں کتابیں لکھتا ہے۔ مصنف ہے۔ پر ظالم نے جو کام کیا حد کو پہنچا دیا۔ ورزش کی تو وہ ایسی ہی، آپ لوگوں سے شوق کیا تو کوئی گھر نہ چھوڑا۔ ہے دھن کا پکا، جدھر لگ گیا

لگ گیا۔ میں نے کہا، کسی راگ میں پڑے ہی نہیں ہونگے۔ ورنہ ساری دھنیں بھول جاتے۔ ایک مضراب کی چوٹ ساری عمر آس دیتی رہتی ہے کسی جھنکار سے واسطہ ہی نہیں پڑا نہیں تو ساری چوکڑی بھول جاتے۔

ایک نے کہا یادش بخیر وہ چلے آتے ہیں۔

نہ تنہا عشق از دیدار خیزد

بسا ایں دولت از گفتار خیزد

باتیں سُنکر دل میں خواہش دیدار پیدا ہوگئی۔ آنکھ اُٹھا کر دیکھا تو ایک متوسط قد وقامت کا انسان آتا نظر آیا۔ قریب آیا تو خط وخال ظاہر ہوئے آنکھیں شوخ تھیں ولے چہرہ متین۔ نقش ونگار بے نذاست آشکار۔ چال میں بغیر تصنع کے دلیری۔ جوں جوں قریب آتا گیا چہرہ پر مسکراہٹ کھیلتی گئی۔ لیکن دماغی تکان کا شائبہ کچھ اس طرح جھلک رہا تھا جیسے موتی میں زردی، میری طرف نگۂ غلط انداز ڈالی اور آنکھیں بچالیں۔

عام دستور اس کے خلاف ہے۔ لوگ میری طرف گھورا کرتے ہیں۔ یہ اپنے دوستوں سے متوجہ ہوا۔ دیر میں آنے کی معافی چاہی۔ اظہار مجبوری ومعذوری کیا۔ ایک نے شکایت کی کہ اب تو جناب کی صورت ہی نظر نہیں آتی۔ نہایت آسودگی سے جواب دیا۔ بندہ نواز اگر یہ شیو کرنے کی لعنت نازل نہ ہو تو شاید میں خود بھی اپنی صورت کو ترسوں۔ عجب جاذب انسان ہے۔ سب اُس کی جانب رجوع

ہو گئے۔ میں پس منظر میں رہ گئی۔ ایسا کم ہوتا ہے۔ دل میں رشک و حسد پیدا ہوا۔ آخر کار وہ میری طرف ملتفت ہوا تو سب کی نگاہیں بھی ادھر پھریں۔ بولا۔ جناب اُس روز آپ ہی کا ذکر خیر فرما رہے تھے۔ ایک نے کہا، جی ہاں یہی وہ زہرہ ہیں جن کے ہم سب مشتری ہیں۔ ایک ادائے خاص سے جواب دیا، کیا عرض کروں، مجھے تو آپ بنات النعش معلوم ہوتے ہیں۔ میں جلی تو بیٹھی ہی تھی فوراً کہہ اُٹھی کہیں غالب کا یہ شعر نہ صادق آجائے۔

تھیں بنات النعش گردوں دن کے پردے میں نہاں
شب کو اُن کے جی میں کیا آئی کہ عُریاں ہو گئیں

جواب ملا رات ہونے دیجئے۔

وہ محفل پر چھایا دکھائی دیتا تھا۔ میں اپنے کو کچھ چھوٹا محسوس کر رہی تھی۔ تفوق قائم رکھنے کیلئے بولی۔ اور جناب مریخ ہیں۔ جواب ملا، جی نہیں عطارد، دبیر فلک۔

دماغ ہاتھ پیر ڈالے دیتا تھا۔ رشک کچو کے دے رہا تھا۔ میں نے کہا، سپاہی درکار ہے۔ بولا، جی نہیں روشنائی۔ میں نے کہا، ماشاء اللہ آسمان پر دماغ ہے۔ جواب ملا قرین زہرہ بھی تو ہوں۔ اِس فقرے کے ساتھ اس کی آنکھیں کہہ رہی تھیں کہ میں آپ کے بس کا نہیں ہوں۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ صلح و آشتی کر لیں، بس بہت ہو چکی۔

ہیں نہ شکست ماننے کی عادی نہ ہتھیار ڈالنے کی خوگر، اور پھر اتنوں کے سامنے پسپائی کا اعتراف۔ دل نہ مانا، ایک صاحب بولے کیوں بی زہرہ آج ملا ہے سیر کو سوا سیر۔ اُن کی کپڑے کی دُکان تھی اور اکثر احباب انہیں دھجّی پھٹ کہتے تھے۔ میں نے جواب دیا، جناب کو سیر سوا سیر سے کیا کام۔ آپ تو گز سوا گز کی فکر کیجئے۔ کہیں اپنا تھان نہ بھول جائیں۔

اُس وقت مجھے یہ سب بُرے لگ رہے تھے۔ دل چاہتا تھا کہ کاظم ہو اور میں ہوں اور ساری عمر اُس سے فلع جگت لڑتی رہوں۔ حتّٰی کہ ہرا دوں۔

ان بزاز صاحب کو خود تو جواب بن نہ پڑا۔ کاظم کی آڑ ڈھونڈھی بولے، بھئی کاظم میاں یہ ابھی ابھی آپ کے آنے سے پہلے فرما رہی تھیں۔ ان کو کسی آہو چشم سے واسطہ ہی نہیں پڑا۔ ورنہ ساری چوکڑی بھول جاتیں۔ وہ تو شمشیر عریاں تیار ہی رہتا تھا۔ بولا۔ یہ وحشی سا رام کر گیا رام نہ ہوا۔ میں بھی تلی بیٹھی تھی۔ بولی، پالا پڑے تو پتہ چلے۔ جواب ملا یہ روگ کبھی پالا نہیں۔ میں نے کہا پالا چھوڑ کر بھاگ جایئے گا۔ اللہ رے دماغ، فقرہ ہاتھ باندھے کھڑے رہتے تھے۔ فوراً جواب دیا۔ کیا عرض کروں بہت سے گلرخوں پہ اسی امید میں پالا پڑ گیا۔ دماغ نے ساتھ دینا چھوڑ دیا۔ زبان بولنے سے رہ گئی۔ عقل جواب دے گئی۔ حاضر جوابی رخصت لے گئی۔ میں لاجواب ہو کر رہ گئی۔

دل ہی دل میں پیچ و تاب کھا رہی تھی۔ یہ سب باتوں میں مصروف تھے۔

اِدھر اُدھر کے ذکر اذکار کرتے رہے۔ میں ایک طرف کسی ازکار رفتہ لیڈر کی طرح بیٹھی تھی۔ کاظم نے میری جانب دیکھا اور کہا آپ کیوں چُپ ہیں؟ اِس مرتبہ پھر اس کی پُر معنی آنکھوں میں صلح کا پیغام تھا۔ میں نے جواب دیا۔ آپ کی باتیں سُن رہی ہوں۔ کہنے لگا ہم مردوں کی رُوکھی پھیکی باتوں میں آپ کو کیا مزا آئے گا۔ ایک اور بولے۔ ہاں صاحب باتیں تو ان کی ہوتی ہیں چکنی چپڑی۔ روئے سخن میری طرف تھا۔ جواب دینا لازم۔ میں نے کہا۔ کیوں روغن قازمل رہے ہو۔

کاظم بولا، یقین جانئے آپ سے مِل کر دل بہت خوش ہوا۔ میں نے ایسی حاضر جواب صاحبہ آج تک نہیں دیکھی تھیں۔

اتنے میں ایک نے کاظم سے پوچھا آج کل کیا کر رہے ہو؟ بولا لکھ رہا ہوں۔ ایک عادت سی ہو گئی ہے۔ سینۂ قرطاس سیاہ کرتا ہی رہتا ہوں میرا جذبہ انتقام نہ مانا۔ فقرہ سُوجھ گیا۔ اور میں نے کہدیا۔ آخر یہ سیاہ کاری کس لئے؟ مُسکراتے ہوئے جواب دیا۔ محترمہ مُہر سیاہی سے کام لیتی ہے تو نام چھوڑ جاتی ہے۔

مجھے جواب بن نہ پڑا۔

کاظم ایک غوطہ کی سی حالت میں دریا کی طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے پوچھا اِس محویت سے کیا دیکھا جا رہا ہے۔ بغیر میری طرف دیکھے دریا پر نظریں جمائے ہوئے بولا۔

" میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ شکاری جال ڈالے۔ بنسیاں لٹکائے ۔ کانٹے چھوڑے بیٹھے ہیں۔

میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ پھنسی ہوئی مچھلی اپنی دوسری بہنوں کے لئے لاسہ بن جاتی ہے۔ اُن کو پھنسانے کے کام آتی ہے۔

میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ قابو شدہ مچھلی بے پروائی سے تھیلے میں ڈال دی جاتی ہے۔ اور نئی پھانسنے کا اہتمام شروع ہو جاتا ہے۔

میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ مچھلی پانی میں رہتی ہے پھر بھی بدبودار ہے۔ حالانکہ پانی کا کام بدبو دور کرنا ہے۔ فطرت کی خرابی فطرت دُور نہیں کرسکتی۔ بہت خوب حاجب

ہم جو مچھلی کھا رہے ہیں اُس میں بساند نہیں۔ عقل انسانی طبعی خرابیوں کو بھی دُور کرسکتی ہے۔

میں یہ بام مچھلی دیکھ رہا ہوں۔ بہاؤ کے خلاف جارہی ہے۔ رفتار زمانہ سے ٹکرا رہی ہے۔ بیچ دریا میں اس کے لئے جگہ نہیں۔ ایک طرف پھینک دی گئی ہے۔ منجدھار کا شفاف رُوح پرور پانی اس کی قسمت کا نہیں۔ کنارِ آب گدلے میں پڑی ہے۔

اپنے سماج کے خلاف جارہی ہے۔ برادری باہر کردی گئی ہے۔ اُبھرتی ہے دبادی جاتی ہے۔ آگے بڑھتی ہے دھکیل دی جاتی ہے۔ منزل مقصود تک نہیں پہنچ سکتی۔ حیات ایک مسلسل تصادم ہو کر رہ گئی ہے۔ اس کی دُنیا دو گز گندا

پانی ہے۔ اسی حلقہ میں گاہ آگے جاتی ہے گاہ پیچھے آتی ہے۔لہریں مسلسل اور منظم ہیں۔ یہ تن تنہا۔طاقت استقامت نہیں رکھتی۔ ٹکرا ٹکرا مرجاتی ہے۔"

میں ایسا محسوس کررہی تھی جیسے منظرِعام پر مجھے عریاں کردیا گیا ہو۔ مجھے ایسا معلوم ہورہا تھا جیسے اکس رے (x-ray) کے فوٹو میں اپنے جسم کے کیڑے دیکھ رہی ہوں۔ اس ماہر جرّاح نے سینہ شق کرکے میرا دل مجھے دکھا دیا تھا۔ اور اس کے ہر نما داغ ایک ایک کرکے گِنا رہا ہے۔

آج مجھے اپنے سامنے ایک اور مکروہ زہرہ نظر آرہی تھی۔ وہ گاہ مجھ میں سما جاتی۔ گاہ سامنے جا کھڑی ہوتی۔ میری طبیعت اس سے نفور تھی۔ میں اسکا قریب آنا پسند نہ کرتی تھی۔ لیکن بے بس تھی۔ وہ جب چاہتی مجھ میں پیوست ہوجاتی تھی۔

مجھے کاظم کی صورت بُری لگ رہی تھی۔ مجھے یہ پردہ اُٹھا دینے والا ہاتھ بُرا لگ رہا تھا۔ مجھے یہ جادوگر بُرا لگ رہا تھا۔ جس نے میرے ہم ذات کو میرے روبرو لا کھڑا کیا۔ مجھے دُنیا کی ہر چیز بُری لگ رہی تھی۔ شاید میں آج اپنے کو خود بُری لگ رہی تھی۔

اب ہم سب اپنی موٹروں کی طرف چلے۔ کاظم خود ڈرائیو کررہا تھا۔ راستہ میں یہ جھگڑا تھا کہ میں کس موٹر میں بیٹھوں۔ اکثر نے کاظم کی کار تجویز کی۔ پر اُس نے خود نہ کہا۔ میرا دل چاہتا تھا کہ وہ درخواست کرے۔ اور میں اِنکار کردوں۔ میں اُس

سے بدلہ لینا چاہتی تھی۔ اُسے ٹھکرانا چاہتی تھی۔ رنج پہنچانا چاہتی تھی۔ جذبۂ انتقام نے مجھے اندھا کر رکھا تھا اور میں اس امید میں اسکی کار کے پاس جا کھڑی ہوئی کہ شاید وہ اپنے برابر کی سیٹ کا دروازہ کھولے اور میں انکار کردوں۔ لیکن یہ کاظم سے بعید تھا۔ اس نے نہایت تپاک سے پیچھے کی سیٹ کا دروازہ کھولا اور جلد باز آنے والوں کے لئے جگہ چھوڑ دی۔ اب ہر شخص اس موٹر میں بیٹھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اور وہ بر خود غلط کھڑا تماشہ دیکھ رہا تھا۔

میں چوٹ کھائی ہوئی ناگن کی طرح اُمید انتقام میں بل کھا رہی تھی موقع کی متلاشی، وقت کی منتظر۔ احساس شکست سینہ میں ڈنک مار رہا تھا۔ میں زخم لگانے والے ہاتھ کے قریب رہنا چاہتی تھی۔ تاکہ ڈسنے کا موقع ہاتھ سے نہ جائے۔ مجھے زہر انتقام چڑھ رہا تھا۔ مجھے کوئی طاقت کاظم کے قریب کھینچ رہی تھی۔ یقیناً یہ نفرت تھی۔ جس کی کشش محبت سے سخت تر ہوتی ہے۔

میں کاظم کی سیٹ پہ ہاتھ رکھکر ذرا آگے کو سرکی۔ میری اُنگلیاں اس کی پیٹھ کو چھو گئیں۔ وہ غیر محسوس طریقہ پہ ذرا آگے کو ہوگیا۔ جیسے میں کوڑھن تھی اور قابلِ نفرت۔

اُنگلیاں خزاں زدہ شاخوں کی طرح جھک کر رہ گئیں۔ ہاتھ کچھ اِس

طرح ناکام سرشار واپس آیا جیسے فلاکت زدہ بابو No vacancy
شن کر۔

ایک صاحب نے گانے کی فرمائش کی۔ میں نے انکار کیا۔ انہوں نے اصرار۔ سچ یہ ہے کہ اس درخواست نہ کرنے والے کی درخواست کا انتظار تھا۔

ایک اور جن کو اپنی موسیقی دانی پر بڑا ناز تھا اور مجھے اس راگ میں لانا چاہتے تھے بولے۔ ہم کو تو پکا گانا پسند ہے۔ کوئی دھرپت ہو جائے ایک خام کار نے غزل کی فرمائش کی۔ کہنے لگے وہ ہاتھی چنگھاڑ سُر نوازی ہمیں ایک آنکھ اچھی نہیں لگتی۔ ان دونوں میں بحث ہونے لگی۔

میں نے کاظم کی کمر پہ ہاتھ رکھا۔ اور کہا۔ جناب ہمہ داں صاحب کا اس معاملہ میں کیا خیال ہے؟ بولا یہ ہیچ مداں انصاف کی کہے گا۔ چونکہ خیر سے نور جہاں کا ہاتھ جہانگیر کی پشت پہ رکھا ہے۔ سب کی نگاہیں میرے ہاتھ پر تھیں اور وہ کچھ مفلوج سا ہو گیا تھا۔

کاظم اگر تجھ سے بدلہ نہ لیا تو میرا نام بھی زہرہ نہیں۔ جو رنڈی ہوں تو تجھے نیچا دکھا کر چھوڑوں گی۔ تو نے میرا ہاتھ جھٹکا ہے۔ میں تیرا دستِ طلب ٹھکراؤں گی۔

سچّے کے شوقین دُمّوں کے پُدرے بولے۔ کیوں بھئی کاظم یہاں کیوں بند۔

ہو گئے۔ بتاؤ نہ دھرپت خیال اچھا یا غزل ٹھمری، دادرا۔ کاظم نے جواب دیا: صاحب بات یہ ہے کہ جس طرح شعر کو الفاظ وزن اور معنی پر تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ اسی طرح راگ کو سُر تال اور رس پر۔ سُر مترادف ہے الفاظ کے تال وزن کے ہم وزن۔ اور رس معنی کے ہم معنی۔ جس طرح بے معنی شعر دل و دماغ پر اثر نہیں کر سکتا۔ بعینہ بے رس راگ جو بات پر مضراب نی نہیں کرتا۔ دل و دماغ کو نہیں چھیڑ سکتا۔ موجودہ دور انحطاط میں۔ پکا گانا محض تال کی کاٹ کا نام ہے اور بس۔ جس میں قطعاً کوئی لطف نہیں — غزل میں کم از کم اتنی تو گنجائش ہے کہ اگر دھن مزا نہیں دیتی تو شعر کے معنی لطف دے جاتے ہیں۔

بات مدلل تھی، میں جواب نہ دے سکی۔ اپنے سب ہتھیار آزما نے چاہ رہی تھی۔ اب کی فرمائش پہ یہ غزل شروع کی ؎

اِس بزم میں جو گردشِ پیمانہ ہو گئی
ہم سے بھی ایک لغزشِ مستانہ ہو گئی

یا تھی وہی نگاہ کہ تھی چارہ سازِ دل
یا اب وہی نظر ہے کہ بیگانہ ہو گئی

کوئی تو بات شمع کے جلنے میں تھی ضرور
جس پر نثار ہستیٔ پروانہ ہو گئی

صد شکر کچھ تو اُن سے ہوئی آج گفتگو
یہ اور بات ہے کہ حریفانہ ہو گئی

اللہ رے اشکباریِ شمع شبِ فراق
جو صبح ہوتے ہوتے اک افسانہ ہو گئی

حسرت کے غمکدہ میں خوشی کا گذر کہاں
تم آ گئے تو رونقِ کاشانہ ہو گئی

کاظم پر عجیب کیفیت طاری تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ ہر شعر ایک جامِ شراب ہے جو اِس مست کو مست تر بنا رہا ہے۔ غلافی آنکھوں پر خمار چھایا۔ خون چہرہ پر چڑھ آیا۔ جھومتا تھا اور داد دیتا تھا۔ ایک ایک شعر دس دس دفعہ گوایا۔ ہر مرتبہ نئی ادا سے درخواست کرتا۔ مجھے اس کا ایک ایک فقرہ یاد ہے۔ ایک ایک جملہ یاد ہے۔ ایک ایک حرف یاد ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ وہ آواز میرے کانوں میں گونج رہی ہے۔ وہ ادا میری آنکھوں میں پھر رہی ہے۔

خرد مند لڑکھڑا رہا تھا۔ ہوشیار مست ہوا جا رہا تھا۔ ہاروت زہرہ کے جال میں آتا نظر آ رہا تھا۔ دامانِ زلیخا دستِ یوسف کھینچ رہا تھا۔ موسیقار اپنا رنگ جما رہا تھا۔ سروں کی بارش میں پاک دامن تردامن کی طرف آ رہا تھا۔ "مطرب بہ نغمہ رہزنِ تمکین و ہوش تھا" (غالب) عقل کا پجاری حواس سے عاری

ہو تا جا رہا تھا ۔ مجھے اپنی ساقی گری پر ناز تھا ۔ دو آتشہ اور سہ آتشہ پلا رہی تھی ۔ راگ راگنی کا مینہ برسا رہی تھی ۔ زیر و بم سے توازنِ دماغی تہہ و بالا کر رہی تھی مست تھی اور مست بنا رہی تھی ۔ کاظم کو اپنا کمال دکھا رہی تھی ۔ کاظم پر چھا رہی تھی ۔ کاظم کو نیچا دکھا رہی تھی ۔ خمارِ کامیابی نے مست کر دیا اور میں مستانہ وار گاتی رہی ۔

افسوس ہر چیز کی انتہا ہے ۔ ہر نگاہ کے آگے حدِ نگاہ ہے ۔ ہم آبادی میں سے ہو کر گزر رہے تھے ، گانا بند کرنا پڑا ۔ طلسم ٹوٹ گیا ۔ نشہ اُتر گیا ۔ اُمیدیں ڈھے گئیں ۔ فرزانہ جو چند ے عقل و خرد سے بیگانہ ہو گیا تھا پھر اپنے مقام پر نظر آیا ۔

ونڈ سکرین پر جو پیچھے کا ٹریفک دیکھنے کیلئے شیشہ لگا تھا اس میں ہم دونوں کی نگاہیں اکثر چار ہو جاتی تھیں ۔ کبھی وہ نظریں بچا لیتا ، کبھی میں ، یہ آنکھ مچولی ہو رہی تھی ۔ سب نے کاظم سے کچھ سنانے کو کہا ۔ ظالم نے یہ شعر گایا ؎

برو ایں دام بر مرغِ دگر نہ
کہ عنقا را بلند است آشیانہ

آپا

ممتاز مفتی

ممتاز مفتی کا شاہکار ۔۔۔

جب کبھی بیٹھے بٹھائے مجھے آپا یاد آتی ہے تو میری آنکھوں کے آگے ایک چھوٹا سا بلوری دیا آجاتا ہے۔ جو مدھم سی لَو سے جل رہا ہو۔

مجھے یاد ہے ایک رات ہم سب چپ چاپ باورچی خانے میں بیٹھے تھے۔ میں، آپا اور امی جان۔ کہ چھوٹا بدو بھاگتا ہوا آیا۔ ان دنوں بدو یہی چھ سات کا ہوگا۔ کہنے لگا "امی جان میں بھی بیاہ کرونگا۔"

"اوہ ابھی سے؟" اماں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ پھر کہنے لگیں "اچھا بدو تمہارا بیاہ آپا سے کردیں؟"

"اونہوں"۔ بدو نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

اماں کہنے لگیں۔ "کیوں آپا کو کیا ہے؟"

"ہم تو چھاجو باجی سے بیاہ کریں گے۔ بدو نے آنکھیں چمکاتے ہوئے کہا۔

اماں نے آپا کی طرف مسکراتے ہوئے دیکھا اور کہنے لگیں "کیوں دیکھو تو آپا کیسی اچھی ہیں۔"

"میں بتاؤں کیسی ہے؟" وہ چلایا۔

"ہاں بتاؤ تو بھلا" اماں نے پوچھا۔ بدّو نے آنکھیں اٹھا کر چاروں طرف دیکھا۔ جیسے کچھ ڈھونڈھ رہا ہو۔ پھر اس کی نگاہ چولھے پر آرکی۔ چولھے میں اپلے کا ایک جلا ہوا ٹکڑا پڑا تھا۔ بدّو نے اسکی طرف اشارہ کیا اور بولا "ایسی" پھر بجلی کے روشن بلب کی طرف انگلی اٹھا کر چیخنے لگا" اور چھاجو باجی ایسی"

اس بات پر ہم سب بہت دیر تک ہنستے رہے۔ اتنے میں تصدق بھائی آ گئے۔ اماں کہنے لگیں" تصدق بدّو سے پوچھنا تو کہ آپا کیسی ہیں" آپا نے تصدق بھائی کو آتے دیکھا تو منہ موڑ کر یوں بیٹھ گئی جیسے ہنڈیا پکانے میں منہمک ہو۔

"ہاں تو کیسی ہے آپا بدّو؟" وہ بولے۔ "بتاؤں" بدّو چلایا۔ اور اس نے اپلے کا ٹکڑا اٹھانے کیلئے ہاتھ بڑھایا۔ غالباً وہ اسے ہاتھ میں لے کر ہمیں دکھانا چاہتا تھا۔ مگر آپا نے جھٹ اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اور انگلی ہلاتے ہوئے بولی" اونہہ" بدّو رونے لگا۔ تو اماں کہنے لگیں۔ پگلے اسے ہاتھ میں نہیں اٹھاتے۔ اس میں چنگاری ہے" "وہ تو جلا ہوا ہے اماں" بدّو نے بسورتے ہوئے کہا۔ اماں بولیں" نہ میرے لال تمہیں نہیں معلوم۔ اسکے اندر تو آگ ہے اوپر سے نہیں دکھائی دیتی" بدّو نے بھولے پن سے پوچھا" کیوں آپا اس میں آگ ہے نا؟" اس وقت آپا کے منہ پر ہلکی سی سرخی دوڑ گئی۔ "میں کیا جانوں" وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ اور پھکنی اٹھا کر جلتی ہوئی آگ میں بے مصرف

پھونکیں مارنے لگی۔

اب میں سمجھتی ہوں کہ آپا دل کی گہرائیوں میں جلتی تھیں۔ اور وہ گہرائیاں اتنی عمیق تھیں کہ بات اُبھرتی بھی تو نکل نہ سکتی۔ اس روز بدو نے کیسی پتے کی بات کہی تھی۔ مگر میں کہا کرتی تھی ”آپا تم تو بس بیٹھی رہتی ہو“ اور وہ مُسکرا کر کہتی ”پگلی“۔ اور اپنے کام میں لگ جاتی۔ ویسے تو وہ سارا دن کام میں لگی رہتی تھی۔ ہر کوئی اسے کسی نہ کسی کام کو کہہ دیتا۔ اور ایک ہی وقت میں اُسے کئی کام کرنے پڑ جاتے ادھر بدو چیختا ”آپا میرا دلیا“۔ اُدھر ابا گھورتے ”سجادہ ابھی تک چائے کیوں نہیں بنی ؟“ بیچ میں اماں بول اُٹھتی ”بٹیا دھوبی کب سے باہر کھڑا ہے“۔ اور آپا چُپ چاپ سارے کاموں سے نبٹ لیتی۔ یہ تو میں خوب جانتی تھی مگر اس کے باوجود خدا جانے کیوں۔ اسے کام کرتے ہوئے دیکھ کر یہ محسوس نہیں ہوتا تھا کہ وہ کام کر رہی ہے یا وہ اتنا کام کرتی ہے۔ مجھے تو بس یہی معلوم ہوتا تھا۔ کہ وہ بیٹھی ہی رہتی ہے۔ اور اُسے اِدھر سے اُدھر گردن موڑنے میں بھی بہت دیر لگتی ہے۔ اور چلتی ہے تو چلتی ہوئی معلوم نہیں ہوتی۔ اس کے علاوہ میں نے آپا کو کبھی قہقہہ مار کر ہنستے ہوئے نہیں سُنا تھا۔ زیادہ سے زیادہ وہ مُسکرا دیا کرتی تھی اور بس، البتہ وہ مسکرایا اکثر کرتی۔ جب وہ مُسکراتی تو اُس کے ہونٹ کھل جاتے اور آنکھیں کسی اثر سے بھیگ جاتیں۔ گویا کسی ندی کے کنارے چاندنی میں کوئی کھرج میں سندھی بھیروں الاپ رہا ہو۔ مگر ان دنوں مجھے چاندنی اور

سندھی بکھیروں کا کیا پتہ تھا۔ اس لئے میں سمجھتی تھی کہ آپا چپکی بیٹھی ہی رہتی ہے۔ ذرا نہیں ہنستی۔ اور بن چلے لڑھک کر یہاں سے وہاں پہنچ جاتی ہے۔ جیسے کسی نے اسے دھکیل دیا ہو۔ اس کے برعکس ساحرہ کتنے مزے میں چلتی تھی۔ جیسے دادرے کی تال پر ناچ رہی ہو۔ اور اپنی خالہ زاد بہن ساجو باجی کو چلتے دیکھکر میں کبھی نہ اکتاتی۔ جی چاہتا تھا کہ باجی ہمیشہ میرے پاس ہی رہے۔ اور چلتی چلتی اسی طرح گردن موڑ کر، مدھم آواز میں کہے "ہیں جی۔ کیوں جی ؟" اور اس کی کالی کالی آنکھوں کے گوشے مسکرانے لگیں۔ باجی کی بات بات مجھے کتنی پیاری تھی۔ ساحرہ اور ثریا ہمارے پڑوس میں رہتی تھیں۔ اور دن بھر اُن کا مکان اُن کے قہقہوں سے گونجتا رہتا۔ جیسے کسی مندر میں گھنٹیاں بج رہی ہوں۔ بس میرا جی چاہتا تھا کہ انہیں کے گھر جا رہوں۔ ہمارے گھر میں رکھا ہی کیا تھا۔ ایک بیٹھے رہنے والی آپا۔ ایک "یہ کرو۔ وہ کرو" والی اماں، اور دن بھر حقے پر گڑگڑانے والے ابا۔

اس روز جب میں نے ابا کو امی سے کہتے ہوئے سنا، سچ تو یہ ہے مجھے بے حد غصہ آیا۔ ابا کہنے لگے "سجادہ کی ماں! معلوم ہوتا ہے ساحرہ کے گھر میں بہت سے برتن ہیں۔"

"کیوں" ؟ اماں پوچھنے لگیں۔

کہنے لگے "بس تمام دن برتن ہی بجتے رہتے ہیں اور یا قہقہے لگتے

ہیں۔ جیسے کوئی میلہ ہو۔"

اماں تنک کر بولیں۔ "مجھے کیا معلوم۔ آپ تو بس لوگوں کے گھر کی طرف کان لگائے بیٹھے رہتے ہیں۔"

ابّا کہنے لگے "اُفوہ میرا تو یہ مطلب ہے کہ جہاں لڑکی جوان ہوئی برتن بجنے لگے۔ بازار کے اس موڑ تک لوگوں کو خبر ہو جاتی ہے کہ فلاں گھر میں ایک لڑکی جوان ہو چکی ہے۔ مگر دیکھو نا ہماری سجادہ میں یہ بات قطعی نہیں۔" میں نے ابّا کی بات سُنی اور میرا دل کھولنے لگا۔ بڑی آئی ہے سجادہ۔ جی ہاں۔ اپنی بیٹی جو ہوئی اس وقت میرا جی چاہتا تھا کہ جا کر باورچی خانے میں بیٹھی ہوئی آپا کا مُنہ چڑا دُوں۔ اسی بات پر میں نے دن بھر کھانا نہ کھایا۔ اور دل ہی دل میں کھولتی رہی۔ ابّا۔ ابّا۔ جانتے ہی کیا ہیں۔ بس حُقّہ لیا اور گڑ گڑ کر لیا۔ یا زیادہ سے زیادہ کتاب کھول کر بیٹھ گئے اور گِٹ مِٹ، گِٹ مِٹ کرنے لگے۔ جیسے کوئی بھٹیاری مکی کے دانے بھون رہی ہو۔ سارے گھر میں لے دیکر صرف تصدق بھائی ہی تھے جو دلچسپ باتیں کیا کرتے تھے۔ اور جب ابّا گھر پر نہ ہوتے تو وہ بھاری سی آواز میں گایا بھی کرتے تھے۔ خدا جانے وہ کون سا شعر تھا ——— ہاں

چپ چپ سے وہ بیٹھے ہیں آنکھوں میں نمی سی ہے
نازک سی نگاہوں میں نازک سا فسانہ ہے

آپا انہیں گاتے ہوئے سُنکر کسی نہ کسی بات پر مُسکرا دیتی۔ اور کوئی

بات نہ ہوتی تو وہ بدّو کو ہلکا سا تھپّڑ مار کر کہتی "بدّو روؤ نا" اور پھر آپ ہی آپ بیٹھی مسکراتی رہتی۔ تصدق بھائی میرے پھوپھا کے بیٹے بھائی تھے۔ انہیں ہمارے گھر آئے کوئی یہی دو ماہ ہوئے ہونگے۔ وہ کالج میں پڑھتے تھے۔ پہلے تو وہ بورڈنگ میں رہا کرتے تھے۔ پھر ایک دن جب پھوپھی آئی ہوئی تھیں تو باتوں باتوں میں ان کا ذکر چھڑ گیا۔ پھوپھی کہنے لگیں بورڈنگ میں کھانے کا انتظام ٹھیک نہیں۔ لڑکا آئے دن بیمار رہتا ہے۔ اماں اس بات پر خوب لڑیں۔ کہنے لگیں اپنا گھر موجود ہے تو بورڈنگ میں پڑے رہنے کا مطلب۔ پھر ان دونوں میں بہت سی باتیں ہوئیں۔ اماں کی تو عادت ہے کہ اگلی پچھلی تمام باتیں لے بیٹھتی ہیں۔ غرضکہ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک ہفتہ کے بعد تصدق بھائی بورڈنگ کو چھوڑ کر ہمارے ہاں آ ٹھہرے۔

تصدق بھائی مجھ سے اور بدّو سے بڑی گپیں ہانکا کرتے تھے۔ اُن کی باتیں بے حد دلچسپ ہوتیں۔ بدّو سے تو وہ دن بھر نہ اُکتاتے۔ البتہ آپا سے وہ زیادہ باتیں نہ کرتے کرتے ہی کیسے۔ جب کبھی وہ آپا کے سامنے جاتے، تو آپا کے دوپٹہ کا پلّو آپ ہی آپ سرک کر نیم گھونگٹ سا بن جاتا۔ اور آپا کی بھیگی بھیگی آنکھیں جھک جاتیں اور وہ کسی نہ کسی کام میں شدت سے مصروف دکھائی دیتی۔ اب مجھے خیال آتا ہے کہ آپا اُن کی باتیں غور سے سُنا کرتی تھی۔ گو کہتی کچھ نہ تھی۔ بھائی صاحب بھی بدو سے آپا کے متعلق پوچھتے رہتے۔ لیکن صرف

اُسی وقت جب وہ دونوں اکیلے ہوتے۔ پوچھتے " بدو تمہاری آپا کیا کر رہی ہے؟"
" آپا" بدو لاپرواہی سے دُہراتا " بیٹھی ہے ــــ بُلاؤں ــ"
بھائی صاحب گھبرا کر کہتے "نہیں نہیں۔ اچھا بدو۔ آج نہیں ، یہ دیکھو، اس طرف ، تمہیں دکھائیں ۔"
اور جب بدو کا دھیان اِدھر اُدھر ہو جاتا تو مدھم سی آواز میں کہتے "ارے یار تم تو مُفت کا ڈھنڈورا ہو ۔"
بدو چیخ اٹھتا "کیا ہوں میں ؟" اِس پر وہ میز بجانے لگتے۔ ڈگمگ ڈگمگ ۔ڈھنڈورا۔ یعنی یہ ڈھنڈورا ہے۔ دیکھا ؟ جسے ڈھول بھی کہتے ہیں ۔ ڈگمگ ۔ ڈگمگ ۔ ڈگمگ ۔ سمجھے ؟ اور آپا اکثر چلتے چلتے اُن کے دروازے پر ٹھہر جاتی ۔ اور ان کی باتیں سُنتی رہتی ۔ اور پھر چولھے کے پاس بیٹھ کر آپ ہی آپ مسکراتی ۔ اس وقت اس کے سر سے دوپٹہ سرک جاتا ۔ بالوں کی کوئی لٹ پھسل کر گال پر آگرتی ۔ اور وہ بھیگی بھیگی آنکھیں چولھے میں ناچتے ہوئے شعلوں کی طرح جھومتیں ۔ آپا کے ہونٹ یوں ہلتے گویا وہ گا رہی ہو ۔ مگر الفاظ سُنائی نہ دیتے ۔ ایسے میں اگر اماں یا ابا باورچی خانے میں آ جاتے تو وہ ٹھٹھک کر یوں اپنا دوپٹہ بال اور آنکھیں سنبھالتی گویا کسی بے تکلف محفل میں کوئی بیگانہ آگھسا ہو ۔
ایک دن میں ، آپا اور اماں باہر صحن میں بیٹھی تھیں ۔ اس وقت بھائی اندر اپنے کمرہ میں بدو سے باتیں کر رہے تھے ۔ میرا خیال ہے بھائی کو یہ معلوم

نہیں تھا کہ ہم باہر بیٹھے ہوئے ان کی باتیں سُن رہے ہیں۔ بھائی صاحب بدّو سے کہہ رہے تھے "میرے یار ہم تو اس سے بیاہ کریں گے جو ہم سے انگریزی میں باتیں کر سکے۔ کتابیں پڑھ سکے۔ شطرنج، کیرم اور چیڑ یا کھیل سکے۔ چیڑیا جانتے ہو؟ وہ گول گول پروں والا گیند۔ بلّے سے، یوں ڈز، ٹن ڈزا اور سب سے ضروری بات یہ ہے کہ ہمیں مزے دار کھانے پکا کر کھلا سکے۔ سمجھے؟"

بدّو بولا۔ "ہم تو چھاجو باجی سے بیاہ کریں گے۔"

"اونہہ" بھائی نے کہا۔

بدّو چیخنے لگا۔ "میں جانتا ہوں تم آپا سے بیاہ کرو گے۔ ہاں۔" اس وقت امّاں نے مُسکرا کر آپا کی طرف دیکھا۔ مگر آپا اپنے پاؤں کے انگوٹھے کا ناخن توڑنے میں اس قدر مصروف تھی جیسے کچھ خبر ہی نہ ہو۔ اندر بھائی صاحب کہہ رہے تھے۔ "واہ تمہاری آپا فرنی پکاتی ہے تو اس میں پوری طرح شکر بھی نہیں ڈالتی۔ بالکل پھیکی۔ آخ تھو۔"

بدّو نے کہا۔ "ابّا جو کہتے ہیں۔ فرنی میں کم میٹھا ہونا چاہیئے۔"

وہ بولے "تو وہ اپنے ابّا کے لئے پکاتی ہے نا۔ ہمارے لئے تو نہیں۔"

"میں کہوں آپا سے" بدّو چیخا۔

بھائی بولے "او بگلا۔ ڈھنڈورا۔ لو تمہیں ڈھنڈورا پیٹ کر دکھائیں یہ دیکھو اس طرف۔ ڈگمگ ڈگمگ ڈگمگ۔" بدّو پھر چلّانے لگا۔ "میں جانتا ہوں

تم میز بجا رہے ہو نا۔" "ہاں ہاں اسی طرح ڈھنڈورا پیٹنا ہے نا" بھائی کہہ رہے تھے۔ کشتیوں میں۔ اچھا تو تم نے کبھی کشتی لڑی ہے۔ آؤ۔ ہم تم کشتی لڑیں۔ میں ہو اگاما اور تم تو پہلوان۔ لو۔ آؤ۔ ٹھہرو۔ جب میں تین کہوں۔ اور اس کے ساتھ ہی انہوں نے تو ہم آواز میں کہا" ارے یار تمہاری دوستی تو مجھے بہت مہنگی پڑتی ہے۔"

میرا خیال ہے آپا ہنسی نہ روک سکی۔ اس لئے وہ اٹھ کر باورچی خانے میں چلی گئی۔ میرا تو ہنسی کے مارے دم نکلا جا رہا تھا۔ اور اماں نے تو اپنے منہ میں دوپٹہ ٹھونس لیا تھا کہ آواز نہ نکلے۔

میں اور آپا دونوں اپنے کمرے میں بیٹھے تھے کہ بھائی صاحب آ گئے۔ کہنے لگے "کیا پڑھ رہی ہو جہنا۔" ان کے منہ سے جہینا سن کر مجھے بڑی خوشی ہوتی تھی۔ حالانکہ مجھے اپنے نام سے بے حد نفرت تھی۔ نور جہاں کیسا پرانا نام تھا۔ بولتے ہی منہ میں باسی روٹی کا مزا آنے لگتا۔ میں تو نور جہاں سنکر یوں محسوس کیا کرتی تھی جیسے کسی تاریخ کی کتاب کے بوسیدہ ورق سے کوئی بوڑھی اماں سونٹا ٹیکتی ہوئی آ رہی ہوں۔ مگر بھائی صاحب کو نام بگاڑ کر اسے سنوار دینے میں کمال حاصل تھا۔ ان کے منہ سے جہینا سنکر مجھے اپنے نام سے کوئی شکایت نہ رہتی۔ اور یوں محسوس کرتی۔ گویا میں ایران کی شہزادی ہوں۔ آپا کو وہ سجادہ سے سجدے کہا کرتے تھے۔ مگر وہ تو

پُرانی بات تھی۔ جب آپا چھوٹی تھی۔ اب تو بھائی جان اسے سجدے نہ کہتے بلکہ اس کا پورا نام تک لینے سے گھبراتے تھے۔ خیر میں نے جواب دیا "سکول کا کام کر رہی ہوں۔"

پوچھنے لگے "تم نے کوئی برنرڈشا کی کتاب پڑھی ہے کیا؟"

میں نے کہا "نہیں"

اُنہوں نے میرے اور آپا کے درمیان دیوار پر لٹکی ہوئی گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "تمہاری آپا نے تو ہارٹ بریک ہاؤس پڑھی ہوگی"۔ غالباً وہ کنکھیوں سے آپا کی طرف دیکھ رہے ہونگے۔

آپا نے آنکھیں اٹھائے بغیر ہی سر ہلا دیا۔ اور مدھم سی آواز میں کہا "نہیں" اور سوئیٹر بُننے میں لگی رہی۔

بھائی بولے "اوہ کیا بتاؤں مینا کہ وہ کیا چیز ہے۔ نشہ ہے نشہ خالص نشہ۔ تم اسے ضرور پڑھو۔ بالکل آسان ہے۔ یعنی امتحان کے بعد ضرور پڑھنا۔ میرے پاس پڑی ہے۔"

میں نے کہا "ضرور پڑھونگی۔"

پھر پوچھنے لگے "میں پوچھتا ہوں تمہاری آپا نے میٹرک کے بعد پڑھنا چھوڑ کیوں دیا؟"

میں نے چڑ کر کہا "مجھے کیا معلوم۔ آپ خود ہی پوچھ لیجئے۔" حالانکہ

مجھے اچھی طرح سے معلوم تھا کہ آپا نے کالج میں جانے سے کیوں انکار کیا تھا۔
کہتی تھی میرا تو کالج جانے کو جی نہیں چاہتا۔ وہاں لڑکیوں کو دیکھ کر ایسا معلوم
ہوتا ہے گویا کوئی نمائش گاہ ہو۔ درسگاہ تو معلوم ہی نہیں ہوتی۔ جیسے مطالعہ
کے بہانے میلہ ہو رہا ہو۔ مجھے آپا کی یہ بات بہت بُری لگی تھی۔ میں جانتی
تھی کہ وہ گھر بیٹھ رہنے کیلئے کالج جانا نہیں چاہتی۔ بڑی آئی تھی نکتہ چین۔
اس کے علاوہ جب کبھی بھائی جان آپا کی بات کرتے تو میں خواہ مخواہ چڑ جاتی
آپا تو بات کا جواب تک نہیں دیتی۔ اور یہ آپا آپا کر رہے ہیں۔ اور پھر آپا
کی بات مجھ سے پوچھنے کا مطلب۔ میں کیا ٹیلیفون تھی۔ خود آپا سے پوچھ
لیتے۔ اور آپا۔ بیٹھی ہوئی گم صُم آپا بھیگی بلی!!

شام کو ابّا کھانے پر بیٹھے ہوئے چلّا اٹھے "آج فیرنی میں اتنی شکر
کیوں ہے؟ قند سے ہونٹ چپکے جاتے ہیں۔ سجادہ۔ سجادہ بیٹی۔ کیا کھانڈ
اتنی سستی ہو گئی ہے؟ ایک لقمہ نگلنا بھی مشکل ہے"

آپا کی بھیگی بھیگی آنکھیں جھوم رہی تھیں۔ حالانکہ جب کبھی ابا جان خفا
ہوتے تو آپا کا رنگ پیلا پڑ جاتا۔ مگر اس وقت اُسکے گال تمتما رہے تھے۔ کہنے لگی
"شاید زیادہ پڑ گیا ہو" یہ کہہ کر وہ تو باورچی خانے میں چلی گئی اور میں دانت
پیس رہی تھی "شاید۔ کیا خوب شاید"

اُدھر ابا بدستور بڑبڑا رہے تھے۔ چار پانچ دن سے دیکھ رہا ہوں کہ فیرنی

میں قند بڑھتی جا رہی ہے"۔ صحن سے اماں دوڑی دوڑی آئیں۔ اور آتے ہی ابا پہ برس پڑیں، جیسے ان کی عادت ہے "آپ تو ناحق بگڑتے ہیں۔ آپ ہلکا میٹھا پسند کرتے ہیں، تو کیا باقی لوگ بھی کم کھائیں۔ اللہ رکھے گھر میں جوان لڑکا ہے۔ اس کا تو خیال کرنا چاہیئے"۔ ابا کو جان چھڑانی مشکل ہو گئی۔ کہنے لگے۔" اوہ یہ بات ہے مجھے بتا دیا ہوتا۔ میں کہتا ہوں سجادہ کی ماں"—— اور وہ دونوں کھسر پھسر کرنے لگے۔

آپا ساحرہ کے گھر جانے کو تیار ہوئی، تو میں بڑی حیران ہوئی آپا تو اُن سے ملنا تو کیا بات تک کرنا پسند نہیں کرتی تھی۔ بلکہ اس کے نام پر ہی ناک بھوں چڑھایا کرتی تھی۔ میں نے خیال کیا ضرور کوئی بھید ہے اس بات میں، کبھی کبھار ساحرہ دیوار کے ساتھ چارپائی کھڑی کر کے اس پر چڑھ کر ہماری طرف جھانکتی، اور کسی نہ کسی بات سے سلسلۂ گفتگو کو دراز کرنے کی کوشش کرتی تو آپا بڑی بے دلی سے دو ایک باتوں پر ہی اُسے ٹال دیتی۔ آپ ہی آپ بول اُٹھتی، ابھی تو اتنا کام پڑا ہے اور میں یہاں کھڑی ہوں۔ یہ کہکر وہ باورچی خانے میں جا بیٹھتی۔ خیر! اُس وقت تو میں چپ چاپ بیٹھی رہی۔ مگر آپا جب لوٹ چکی تو کچھ عرصے کے بعد چُپکے سے میں بھی ساحرہ کے گھر جا پہنچی۔ باتوں ہی باتوں میں میں نے ذکر چھیڑ دیا۔ آج آپا آئی تھی۔

ساحرہ نے ناخن پہ پالش لگاتے ہوئے کہا۔" ہاں کوئی کتاب منگوانے کو کہہ گئی ہے۔ خدا جانے کیا نام ہے اُس کا۔ ہاں۔ ہارٹ بریک ہاؤس۔"

آپا اس کتاب کو مجھ سے چھپا کر دراز میں مقفل رکھتی تھی۔ مجھے کیا معلوم

نہ تھا۔ رات کو وہ بار بار کبھی میری طرف اور کبھی گھڑی کی طرف دیکھتی رہتی۔ اُسے یوں مضطرب دیکھکر میں دو ایک جھوٹی انگڑائیاں لیتی اور پھر کتاب بند کرکے رضائی میں یوں پڑجاتی جیسے مدت سے گہری نیند میں ڈوب چکی ہوں۔ جب انہیں یقین ہو جاتا کہ میں سو چکی ہوں، تو دراز کھول کر وہ کتاب نکال لیتی۔ اور اُسے پڑھنا شروع کردیتی۔ آخر ایک دن مجھ سے نہ رہا گیا۔ میں نے رضائی سے مُنہ نکال کر پوچھ ہی لیا "آپا یہ ہارٹ بریک ہاوس کا مطلب کیا ہے۔ دل توڑنے والا گھر۔ اس کے کیا معنی ہوئے؟" پہلے تو آپا ٹھٹھک گئی پھر وہ سنبھل کر اُٹھی اور بیٹھ گئی۔ مگر اس نے میری بات کا جواب نہ دیا۔ میں نے اس کی خاموشی سے جل کر کہا۔ اس لحاظ سے "ہمارا گھر بھی ہارٹ بریک ہے۔"

کہنے لگی "میں کیا جانوں۔"

میں نے اُسے جلانے کو کہا "ہاں ہماری آپا بھلا کیا جانے۔" میرا خیال ہے یہ بات ضرور اسکے دل کو لگی ہوگی۔ کیونکہ اس نے کتاب رکھدی اور بتی بُجھا کر سوگئی۔

ایک دن یوں ہی پھرتے پھراتے میں بھائی جان کے کمرہ میں جا نکلی۔ پہلے تو بھائی جان اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔ پھر پوچھنے لگے "جہینا اچھا یہ تو بتاؤ۔ کیا تمہاری آپا کو فروٹ سلاد بنانا آتا ہے۔ میں نے کہا۔ میں کیا جانوں۔ جاکر آپا سے پوچھ لیجئے۔ ہنس کر کہنے لگے "آج کیا کسی سے لڑکر آئی ہو۔"

"کیوں میں لڑاکا ہوں؟" میں نے کہا۔

بولے "نہیں ابھی تو لڑاکی ہو۔ شاید کسی دن لڑاکا ہو جاؤ۔" اس پہ میری

ہنسی نکل گئی۔ وہ کہنے لگے۔ دیکھو جھبیا مجھے لڑنا بے حد پسند ہے۔ میں تو ایسی لڑکی سے بیاہ کروں گا جو باقاعدہ صبح سے شام تک لڑ سکے۔ ذرا نہ اکتائے جانے کیوں، مگر میں شرما گئی۔ اور بات بدلنے کی خاطر میں نے پوچھا" فروٹ سلاد کیا ہوتا ہے بھائی جان ؟"

بولے۔" وہ بھی کچھ ہوتا ہے۔ سفید سفید۔ لال لال۔ کالا کالا۔ نیلا نیلا سا"
میں ان کی بات سنکر بہت ہنسی۔ پھر وہ کہنے لگے۔ وہ مجھے بے حد پسند ہے۔ یہاں تو ج ہے ناہم نیرنی کھا کھا کر اکتا گئے۔ میرا خیال ہے یہ بات آپا نے ضرور سن لی ہوگی۔ چونکہ اسی شام کو وہ باورچی خانے میں بیٹھی "نعمت خانہ" پڑھ رہی تھی۔ اس دن کے بعد روز بلا ناغہ وہ کھانے پکانے سے فارغ ہو کر فروٹ سلاد بنانے کی مشق کیا کرتی اور ہم میں سے کوئی اس کے پاس چلا جاتا تو جھٹ فروٹ سلاد کی کشتی چھپا دیتی۔ ایک روز آپا کو چھیڑنے کی خاطر میں نے بدو سے کہا۔" بدو بھلا پوچھو تو وہ کشتی جو آپا کے پیچھے پڑی ہے اس میں کیا ہے ؟"

بدو ہاتھ دھو کر آپا کے پیچھے پڑ گیا۔ حتیٰ کہ آپا کو وہ کشتی بدو کو دینی ہی پڑی۔ پھر میں نے بدو کو اور بھی چمکا دیا۔ میں نے کہا۔" بدو جاؤ تو۔ بھائی جان سے پوچھو کہ اس کھانے کا کیا نام ہے۔"؟

بدو بھائی جان کے کمرے کی طرف جانے لگا تو آپا نے اٹھ کر وہ کشتی اس سے چھین لی۔ اور میری طرف گھور کر دیکھا۔ پہلی مرتبہ آپا نے مجھے یوں گھورا تھا۔ اس رات آپا شام ہی سے لیٹ گئی۔ مجھے صاف دکھائی دیتا تھا کہ وہ رضائی میں پڑی رو رہی ہے۔ اس وقت مجھے اپنی بات پر بہت افسوس ہوا۔

میرا جی چاہتا تھا کہ اٹھکر آپا کے پاؤں پڑ جاؤں۔ اور اسے خوب پیار کروں ۔ مگر میں ویسے ہی چپ چاپ بیٹھی رہی ۔ اور کتاب کا ایک لفظ تک نہ پڑھ سکی ۔

انہیں دنوں میری خالہ زاد بہن ساجدہ جسے ہم سب ساجو باجی کہا کرتے تھے ، میٹرک کا امتحان دینے کے لئے ہمارے گھر آ ٹھہری ۔ ساجو باجی کے آنے پر ہمارے گھر میں رونق ہوگئی ۔ ہمارا گھر بھی قہقہوں سے گونج اٹھا ۔ ساحرہ اور ثریا چارپائیوں پر کھڑی ہوکر باجی سے باتیں کرتی رہتیں ۔ بدو چھاجو باجی ۔ چھاجو باجی ۔" چیختا پھرتا اور کہتا " ہم تو چھاجو باجی سے بیاہ کریں گے ۔"

باجی کہتی " شکل تو دیکھو اپنی ۔ پہلے منہ دھو آؤ ۔" پھر وہ بھائی صاحب کی طرف یوں گردن موڑتی کہ اس کی کالی کالی آنکھوں کے گوشے مسکرانے لگتے ۔ اور وہ پنجم تان میں پوچھتی ۔ "ہے نا بھئی جا آن ۔ کیوں جی ؟"

باجی کے منہ سے " بھئی جا آن " کچھ ایسا بھلا سنائی دیتا کہ میں خوشی سے پھولی نہ سماتی ۔ اس کے برعکس جب کبھی آپا " بھائی صاحب " کہتی تو کیسا بھدا معلوم ہوتا ۔ گویا وہ واقعی انہیں بھائی کہہ رہی ہو اور پھر " صاحب " جیسے حلق میں کچھ پھنسا ہوا ہو ۔ مگر باجی " صاحب " کی جگہ " جا آن " کہکر اس سادے سے لفظ میں جان ڈال دیتی تھی ۔ " جا آن " کی گونج میں بھائی دب جاتا ۔ اور یہ محسوس ہی نہ ہوتا کہ وہ انہیں بھائی کہہ رہی ہے ۔ اس کے علاوہ " بھئی جا آن " کہکر وہ ایسی کالی کالی اور چمک دار آنکھوں سے دیکھتی اور آنکھوں ہی آنکھوں میں ہنستی کہ سننے والے کو قطعی یہ گمان نہ ہوتا کہ اسے بھائی کہا گیا ہے ۔ آپا کے " بھائی صاحب " اور باجی کے " بھئی جا آن " میں کتنا فرق تھا ۔

باجی کے آنے پر آپا کا بیٹھ رہنا بالکل بیٹھ رہنا ہی ہوگیا۔ بدو نے بھائی
جان سے کھیلنا چھوڑ دیا۔ وہ باجی کے ارد گرد پھیرتا رہتا۔ اور باجی بھائی جان
سے کبھی شطرنج کبھی کیرم کھیلتی۔ باجی کہتی "بھائی جاآن ایک بورڈ لگے گا؟"
بھائی جان باجی کی موجودگی میں بدو سے کہتے "کیوں میاں بدو کوئی ہے جو ہم
سے شطرنج میں پٹنا چاہتا ہو؟" باجی بول اٹھتی "آپا سے پوچھئے۔" بھائی کہتے
"اونہہ۔ باجی جھوٹ موٹ کی سوچ میں پڑ جاتی۔ چہرے پر سنجیدگی پیدا کر لیتی
بھویں سمٹا لیتی اور تیوری چڑھا کر کھڑی رہتی۔ پھر کہتی "اونہہ۔ مجھ سے تو آپ
پٹ جائیں گے۔" بھائی جان کھلکھلا کر ہنس پڑتے اور کہتے "کل جو پٹی تھیں
بھول گئیں کیا؟" وہ جواب دیتی "میں نے کہا۔ چلو بھائی جان کا لحاظ کر دو۔
ورنہ دنیا یہ کہے گی کہ مجھ سے ہار گئے۔" اور پھر یوں ہنستی جیسے گلے میں گھنگھرو
بج رہے ہوں۔

رات کو بھائی جان باورچی خانے ہی میں کھانا کھانے بیٹھ گئے۔ آپا
چپ چاپ چولہے کے سامنے بیٹھی تھی۔ بدو "چچا جو باجی، چچا جو باجی" کہتا ہوا
باجی کے دوپٹے کا پلو پکڑے اس کے آس پاس گھوم رہا تھا۔ باجی بھائی جان کو
چھیڑ رہی تھی۔ کہتی تھی۔ "بھئی جاآن تو صرف ساڑھے چھ پھلکے کھاتے ہیں۔ اس
کے علاوہ فیرنی کی پلیٹ مل جائے تو قطعی مضائقہ نہیں۔ کریں بھی کیا۔ نہ کھائیں
تو ممانی ناراض ہو جائیں۔ انہیں تو خوش رکھنا ہوا۔ ہے نا بھئی جاآن۔" ہم
سب اس بات پر خوب ہنسے۔ پھر باجی ادھر ادھر ٹہلنے لگی۔ اور آپا کے پیچھے جا کر
کھڑی ہوئی۔ آپا کے پیچھے فروٹ سلاد کی کشتی پڑی تھی۔ باجی نے ڈھکنا سرکا کر

دیکھا۔ اور کشتی کو اٹھا لیا۔ پیشتر اس کے کہ آپا کچھ کہہ سکے۔ باجی وہ کشتی بھائی جان کی طرف لے آئی۔ "لیجئے بھئی جا آن۔" اس نے آنکھوں میں ہنستے ہوئے کہا۔ آپ بھی کہتے ہونگے کہ ساجو باجی نے کبھی کچھ کھلایا ہی نہیں۔"

بھائی جان نے دو تین چمچے منہ میں ٹھونس کر کہا "خدا کی قسم بہت اچھا بنا ہے۔ کس نے بنایا ہے یہ؟" باجی نے آپا کی طرف کنکھیوں سے دیکھا اور ہنستے ہوئے کہا۔ "ساجو باجی نے اور کس نے بھئی جا آن کے لئے۔" بدو نے آپا کے منہ کی طرف غور سے دیکھا۔ آپا کا منہ لال ہو رہا تھا۔ بدو چلا اٹھا۔ میں بتاؤں بھائی جان سے آپا نے بڑھ کر بدو کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ اور اسے گود میں اٹھا کر باہر چلی گئیں۔ باجی کے قہقہوں سے کمرہ گونج اٹھا اور بدو کی بات آئی گئی ہو گئی۔ بھائی جان نے باجی کی طرف دیکھا۔ پھر خدا جانے انہیں کیا ہوا اُن کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ اور آنکھیں باجی کے چہرے پر گڑ گئیں۔ خدا جانے کیوں۔ میں نے یوں محسوس کیا جیسے کوئی زبردستی مجھے کمرے سے باہر گھسیٹ رہا ہو۔ میں جھٹ باہر چلی آئی۔ باہر آپا الگنی کے قریب کھڑی تھی۔ اندر بھائی صاحب نے مدھم آواز میں کچھ کہا۔ آپا نے اپنے کان سے دوپٹہ سرکا دیا۔ پھر باجی کی آواز آئی "چھوڑیئے۔ چھوڑیئے۔" اور پھر خاموشی چھا گئی۔

اگلے دن ہم صحن میں بیٹھے تھے۔ اس وقت بھائی جان اپنے کمرے میں پڑھ رہے تھے۔ بدو بھی کہیں اُدھر ہی کھیل رہا تھا۔ باجی حسب معمول بھائی جان کے کمرے میں چلی گئی۔ کہنے لگی "آج ایک دھندناتا بورڈ کر دکھاؤں۔ کیا رائے ہے آپ کی؟" بھائی جان بولے "واہ یہاں سے کِک لگاؤں تو خدا جانے کہاں جا پڑو۔" غالباً

اُنہوں نے باجی کی طرف زور سے پیر چلایا ہوگا۔ وہ بناوٹی غصّے میں چلّائی۔ واہ آپ تو ہمیشہ پیر ہی سے چھیڑتے رہتے ہیں۔" بھائی جان معاً بول اُٹھے۔ "تو کیا ہاتھ سے ـــــ" "چپ چپ۔ خاموش ـــ" باجی چیخی۔ اُس کے بھاگنے کی آواز آئی ایک منٹ تک تو پکڑ دھکڑ سنائی دی۔ پھر خاموشی چھا گئی۔

اتنے میں کہیں سے بدو بھاگتا ہوا آیا۔ کہنے لگا۔ "آپا اندر بھائی جان باجی سے کشتی لڑ رہے ہیں۔ چلو دکھاؤں تمہیں۔ چلو بھی۔" اور آپا کا بازو پکڑ کر گھسیٹنے لگا۔ آپا کا رنگ ہلدی کی طرح زرد ہو رہا تھا۔ اور وہ بت بنی کھڑی تھی۔ بدو نے آپا کو چھوڑ دیا۔ کہنے لگا۔ اماں کہاں ہیں۔ اور وہ کمرے میں اماں کے پاس جانے کے لئے دوڑا۔ آپا نے لپک کر اُسے گود میں اُٹھا لیا۔ کہنے لگی۔ "آؤ تمہیں مٹھائی دوں۔" بدو بسورنے لگا۔ آپا بولیں۔ "آؤ دیکھو تو کیسی اچھی مٹھائی ہے میرے پاس۔" اور اُسے باورچی خانے میں لے گئی۔

اُسی دن۔ شام کو میں نے اپنی کتابوں کی الماری کھولی تو اس میں آپا کی ہارٹ بریک ہاؤس پڑی تھی۔ شاید آپا نے اسے وہاں رکھ دیا ہو۔ بہرصورت میں حیران ہوئی کہ بات کیا ہے۔ مگر آپا باورچی خانے میں چپ چاپ بیٹھی تھی۔ جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ اس کے پیچھے فروٹ سلاد کی کشتی خالی پڑی تھی۔ البتہ آپا کے ہونٹ بھنچے ہوئے تھے۔

بھائی تصدق اور باجی کی شادی کے دو سال بعد ہمیں پہلی بار اُن کے گھر جانے کا اتفاق ہوا۔ اب باجی وہ باجی نہ رہی تھی۔ اس کے وہ قہقہے بھی نہ تھے۔ اُسکا

رنگ زرد تھا اور ماتھے پر شکن سی چڑھی رہتی تھی۔ بھائی صاحب بھی چپ چپ رہتے تھے۔ ایک شام اماں کے علاوہ ہم سب باورچی خانے میں بیٹھے تھے۔ بھائی کہنے لگے ۔" بدو ساجو باجی سے بیاہ کروگے؟"

"اُونہہ ——" بدو نے کہا۔ ہم بیاہ کریں گے ہی نہیں۔"

میں نے پوچھا" بھائی جان یاد ہے جب بدو کہا کرتا تھا" ہم تو چھاجو باجی سے باہ کرینگے"۔ اماں نے پوچھا" آپا سے کیوں نہیں" تو کہنے لگا۔ بتاؤں آپا کیسی ہے" پھر چولھے میں ایک جلتے ہوئے اُپلے کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگا" ایسی" اور" چھاجو باجی؟" میں نے بدو کی طرح بجلی کے بلب کی طرف اشارہ کیا"۔ ایسی"۔ عین اُسی وقت بجلی بجھ گئی۔ اور کمرے میں آگ کی روشنی کے سوا اندھیرا چھا گیا"۔ ہاں یاد ہے۔" بھائی جان نے کہا۔ پھر جب باجی کسی کام کیلئے باہر چلی گئی تو بھائی کہنے لگے" خدا جانے اب بجلی کو کیا ہو گیا ہے۔ جلتی بجھتی ہی رہتی ہے"۔ آپا چپ چاپ بیٹھی چولھے میں راکھ سے دبی ہوئی چنگاریوں کو کرید رہی تھی۔ بھائی جان نے مغموم سی آواز میں کہا" اف سردی کتنی ہے۔ پھر اُٹھ کر آپا کے قریب چولھے کے سامنے جا بیٹھے اور ان سلگتے ہوئے اُپلوں سے ہاتھ سینکنے لگے۔ بولے" ممانی سچ کہتی تھیں کہ ان جلے ہوئے اُپلوں میں آگ دبی ہوتی ہے۔ اُوپر سے نہیں دکھائی دیتی۔ کیوں سجدے؟" آپا پرے سرکنے لگی تو چھن سی آواز آئی۔ جیسے کسی دبی ہوئی چنگاری پر پانی کی بوند پڑی ہو۔ میرا خیال ہے آپا کا آنسو گرا ہوگا۔ بھائی جان منت بھری آواز میں کہنے لگے" اب اس چنگاری کو تو نہ بجھاؤ سجدے دیکھو تو کتنی ٹھنڈ ہے"